مشرق و مغرب کے ادیبوں کے رومان

بھکڑول

اور
دیگر افسانے

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ موسیو موپسان

مترجم
فطرت نگار پریم چند

ناشر
ہندوستانی کتاب گھر
محلہ سنت نگر لاہور

قیمت ڈیڑھ روپیہ

فہرست

ٹیگور

جوگن

دار جیلنگ جا کر دیکھا. بادل اور بوندا باندی سے مطلع تاریک تر ہو رہا ہے گھر سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا. اور گھر میں پڑے پڑے جی اچٹتا ہے.

ہوٹل میں صبح کا ناشتہ کر کے پاؤں میں موٹے بوٹ اور سر سے پاؤں تک برساتی ڈاٹ کر ہوا خوری کے لئے نکل پڑا. بوندا باندی ہو رہی تھی. چاروں طرف بادل منڈلا رہے تھے. یعنی قدرت کوہ ہمالیہ سمیت ساری کائنات کی تصویر کو ربڑ سے گھس گھس کر مٹا ڈالنے کی جسارت کر رہی ہے.

سنسان تاریک سڑک پر اکیلا ٹہلتا ہوا میں سوچ رہا تھا. بے آسرا بادلوں کی کائنات میں تو اب جی اچھا نہیں لگتا. صوتی احساس اپنی تعجب زائی سے کائنات کو پھر سے حواس خمسہ کے ذریعہ پانچوں انداز سے جکڑنے کے لئے بے چین ہو اٹھا.

اتنے میں قریب ہی نسوانیت کی راحت بخش آ[illegible]ز سنائی دی. رونگٹے کھڑے [illegible]و دینے والی آہ و فغان [illegible] دنیا میں کوئی [illegible] بات نہیں ہے. اور اگر او دکوئی وقت

ہوتا تو منہ پھیر کر شاید نہ ٹھہرتا۔ مگر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رونا ساری کائنات کی درد خیزی کو لئے ہوئے میرے کانوں میں کراہت کا باعث ہونے لگا۔ میرے لئے وہ حقیر بات نہیں تھی۔

میں اسی آواز کی طرف ہی آگے بڑھا۔ دیکھا تو گیروے کپڑے زیب تن کئے ایک عورت اسکی پیشانی پر طلائی خشک زلفیں پریشانی کے عالم میں اور سر پر پہاڑ کی مانند بلند جٹا تھی ـــــ سڑک کے کنارے ایک پتھر کے ٹکڑا پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ یہ کوئی نئے غم کا ولاپ نہیں۔ کافی دنوں کا پُرانا غم آج بادلوں کے گھٹا ٹوپ چھا جانے پر اُمڈ پڑا ہے۔

میں جی میں سوچنے لگا۔ یہ تو اچھا رہا من گھڑنت کہانی کی تمہید تو بن گئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھی سنیاسنی رو رہی تھی۔ اس قسم کے نظارہ کو دیکھنے کا وہم و خیال بھی نہیں تھا۔

اس عورت کی قومیت کا اندازہ نہ لگا پایا۔ میں نے سادہ ہندی زبان میں پوچھا ـــــ "کون ہو تم؟ ہوا کیا جو رو رہی ہو؟"

پہلے تو اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادلوں کی طرح پانی سے لبریز آنکھوں سے متوجہ ہو کر ایک بار اُس نے میری طرف دیکھ ضرور لیا۔

میں نے پھر کہا ـــــ "مجھ سے ڈریں نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں۔"

یہ سُن کر وہ ہنسنے لگی۔ اور خالص ہندوستانی زبان میں گویا ہوئی ـــــ کافی دنوں سے خوف کو اپنے قریب نہیں آنے دیا کرتی۔ شرم و حیا کو بھی دھتا بتا چکی ہوں۔ بابو جی ایک زمانہ تھا۔ جب میں حرم سرا میں رہا کرتی تھی۔ جہاں اپنا سگا بھائی

بھی بہن کے حکم سے آسکتا ہے۔ مگر آج دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے"

پہلے تو ذرا غصہ آیا۔ کیونکہ میرا ٹھاٹھ باٹھ سب صاحبی انداز اور طرز نو کا تھا۔ اور وہ بدبخت بلا خوف مجھے بابوجی کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ سوچا۔ یہاں پر بھی اپنا ناول ختم کرکے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے تیز رفتاری سے اکڑ کر آگے بڑھ جاؤں مگر دل میں جو خلفشار تھا۔ اس کے سامنے سر جھک گیا۔ میں نے قدرے بلند آہنگی سے گردن ٹیڑھی کرکے پوچھا۔۔۔ "میں تمہاری کچھ مدد کرسکتا ہوں؟ تم کیا چاہتی ہو؟"

اس نے ایک بار میری طرف متوجہ ہوکر دیکھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مختصراً جواب دیا۔۔۔ "میں بدایوں کے نواب غلام قادر خاں کی بیٹی ہوں"

بدایوں کس ملک میں ہے۔ اور غلام قادر خاں کونسے نواب ہیں اور انکی بیٹی کس دکھ سے سنیاسنی کے لباس میں دارجیلنگ میں کلکتہ روڈ کے کنارے بیٹھ کر رو سکتی ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ اور نہ میں ایسی باتوں پر اعتماد رکھتا ہوں۔ مگر سوچا نگ میں بھنگ نہیں ڈالونگا۔ کہانی کا سلسلہ خوب جمتا جا رہا ہے۔

انکا تعارف سن کر میں نے فی الفور لمبا سلام ٹھونک کر کہا۔۔۔ "نواب زادی صاحبہ بے ادبی معاف ہو۔ میں پہچان نہیں سکا تھا"

نہ پہچاننے کے کئی مدلل اسباب تھے۔ یعنی میں نے انہیں اس سے قبل کہیں نہیں دیکھا اور پھر اتنا تاریک تر عالم کہ اپنے ہاتھ پاؤں کی شناخت تک مشکل تھی۔

بی بی صاحبہ نے بھی کچھ خیال نہ کیا۔۔۔ تسلی آمیز انداز میں دائیں طرف پڑے ایک پتھر کی سمت اشارہ کرکے مجھے حکم دیا۔۔۔ "بیٹھئے"

دیکھا کہ اس خاتون میں حکم دینے کی صلاحیت ہے۔ کہر سے تربتر یخ بستہ

چٹان پر بیٹھنے کی اجازت پاکر مجھے کچھ اُمید دکھائی دی۔ بدایوں کے غلام قادر خاں کی بیٹی زیب النسا، یا مہر النسا، یا جہاں آرا نے مجھے دارجیلنگ میں کلکتہ روڈ پر اپنے قریب بیٹھنے کا شرف بخشا ہے۔ ہوٹل سے برساتی اوڑھ کر نکلتے وقت ایسی خوش قسمتی کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔

ہمالیہ کی آغوش میں پتھریلے کھنڈر پر بیٹھے ہوئے دو مسافر عورت و مرد کی راز دارانہ سرگذشت کو گنگناتے ہوئے شاعرانہ انداز میں سُنیں گے۔ کانوں میں دُور سے پہاڑوں کی چوٹیوں کو عبور کرکے آتی ہوئی جھرنے کی جھر جھر کی خوش آیند آواز اور کالیداس کے "میگھ دوت" - کمار سمبھو - کے تعجب خیز گانوں کی جھنکار آنے لگی۔ تاہم یہ بات سب کو تسلیم کرنی پڑیگی۔ کہ بوٹ اور برساتی پہن کر کلکتہ روڈ کے کنارے ایک غربت زدہ ہندوستانی خاتون کے ہمراہ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی خودداد عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ بہت کم بنگالی ضبط سے کام لے سکتے ہیں۔ مگر اس روز کہر سے چاروں طرف تاریکی مسلّط تھی۔ دُنیا کے سامنے جھجک اور ڈر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس بے پناہ تاریکی میں صرف بدایوں کے نواب غلام قادر خاں کی بیٹی اور میں نئے شباب میں بنگالی صاحب ——— دونوں پتھر کے ٹکڑوں پر ساری کائنات کی قیامت زائی کے نیچے ہوتے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس تقریب اور پریم ملن کے راز کا صرف ہمیں ہی علم تھا۔ اور کسی کی قسمت میں نہیں تھا۔

میں نے کہا ——— نواب زادی صاحبہ! تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی؟

بدایوں کی نواب زادی نے پیشانی پر تھپیڑ رسید کرکے کہا ——— یہ کون کھیل کھیلتا ہے۔ میں کیا جانوں۔ اتنے بڑے ہمالیہ پہاڑ کو معمولی کہر سے کس نے چھپا رکھا ہے!

میں نے کسی طرح کی منطق نہ بگھیر کر مان لیا اور کہا ـــــ "ٹھیک ہے قسمت کی بات کون جانتا ہے۔ ہم لوگ تو حشرت الارض ہیں۔"

اگر دلیل بازی سے کام لیتا تو بیگم صاحبہ کو بھی آسانی سے نہ چھوڑتا۔ دلی خیالات کو میں الفاظ کے قالب میں منتقلب نہ کر پایا۔ دربان اور نوکروں چاکروں کے بوتے پر جو مجھے کچھ تھوڑا بہت ہندی کی مہارت تھی۔ وہ یہاں کلکتہ روڈ پر بیٹھی ہوئی بدایوں کی نواب زادی کے ساتھ دلی جذبات کے اظہار کے لئے ناکافی تھی۔

نواب زادی نے کہا ـــــ "میری زندگی کی عجیب کہانی آج ہی ختم ہوگئی ہے اگر اجازت ہو تو کہوں؟"

میں نے عجلت سے کہا ـــــ "آپ بھی کیا کہتی ہیں۔ اجازت کیسی۔ اگر آپ مہربانی کریں تو سن کر اپنے آپ کو بامُراد کر سکونگا۔"

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ میں نے بالکل یہی لفظ کہے تھے ـــــ ہاں کہنے کا ارادہ تھا۔ مگر وقت کہاں نواب زادی جب بول رہی تھی۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اوس سے ڈھلے ہوئے چھلکتے سانولے رنگ کے سنہری بالوں سے پر بھات کا دلکش نظارہ سرسراتی ہوئی بادِ نسیم کے ساتھ لہریں لے رہا تھا۔ ہر بات میں ایسی سادگی ایسی خوشنمائی اور الفاظ کی روانی تھی۔ بڑا عجیب کر جنگلیوں کی مانند جواب دے رہا تھا۔ محاورہ بندی اور طرزِ بیان کی سادگی کا مجھے کسی زمانہ میں ایسا احساس نہیں تھا۔ نواب زادی کے ساتھ بات چیت کے وقت آج پہلے پہل میں اپنی اخلاقی کمزوری کا قدم قدم پر احساس پا رہا ہوں۔

شہزادی نے کہا ـــــ میرے باپ کے خاندان میں شاہی نسل کا خون

موجود تھا۔ اسی لئے میرا رشتہ کہیں بھی استوار نہ ہو پایا۔ میرے لئے کوئی قابل دُلہا نہ مل سکا۔ میرے ساتھ بیاہ کے ارادہ سے لکھنؤ کے نواب نے اپنی طرف سے پیغام بھی بھیجا تھا۔ والد ماجد ٹال مٹول کرنے لگے۔ اِتنے میں دانتوں سے کارتوس کاٹنے کے متعلق سرکاری فوج میں سرکار کے خلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور توپوں کے دھواں سے ہندوستان بھر میں تاریکی چھا گئی۔

نسوانی گلے سے بالخصوص، نوابوں کے خاندان کی عورت کے منہ سے کبھی ہندوستانی زبان نہیں سُنی تھی۔ سُن کر اچھی طرح سمجھ میں آ گیا۔ کہ یہ زبان امیروں کی ہے۔ یہ جس زمانہ کی زبان ہے وہ زمانہ اب نہیں رہا۔ آج ریلوے اور ٹیلیگراف سے اور کام کاج کی بھیڑ سے اور خاندانی رسم و رواج کے مٹ جانے سے سب کچھ اونے اور بے لذت ہو گیا ہے۔ نواب زادی کے اندازِ بیان سے صرف اُس انگریزوں کے آباد کئے ہوئے دارجیلنگ میں گھنے کہر کے عالم میں بھی میری آنکھوں کے سامنے مغل اعظم کی عظمت نمایاں ہو اٹھی۔ سفید مرمریں آسمان سے فلک بوس ہونے والے محل۔ سڑکوں پر لمبی لمبی دُموں والے گھوڑوں کی پیٹھ پر ساز۔ ہاتھیوں کی پیٹھ سنہری جھالر دار اور ہودج۔ شہریوں کے سر پر عجیب و غریب رنگ کی پگڑیاں۔ جامے دار اور ریشمی تن زیب سے بنے ہوئے جامے۔ پائجامے۔ کمربند سے لٹکی ہوئی تلواریں۔ زری دار جوتوں کی ٹیڑھی نوکیں ——— فرصت کا طویل وقت۔ ڈھیلی اور لمبی پوشاکیں۔ حد سے زیادہ خوش اخلاقی ——— ادب قاعدے

نواب زادی کہنے لگی۔ —— ”ہمارا قلعہ تھا جمنا کے کنارے۔ ہمارے فوج کے سپہ سالار تھے۔ ایک ہندو برہمن۔ اُن کا نام تھا کیسر لعل۔

خاتون نے اس "کیسر لعل" کے لفظ پر حسن لطیف کی ملائمیت کا سارا انداز بیک جنبش توڑ دیا۔ میں ہاتھ کی چھڑی کو ذرا زمین پر رکھ کر قدرے ہلا ہلا کر احتیاط سے بیٹھ گیا۔

کہنے لگی ــــ "کیسر لعل کٹر ہندو تھے۔ میں روزانہ اعلی الصبح اُٹھ کر اپنے جھروکے سے دیکھتی تھی ــــ کیسر لعل جمنا کے سینہ تک پانی میں گھس کر پر دکھشنا دیتے ہوئے دست بستہ طلوع آفتاب کی ضیاباری کو انجلی دیتے تھے۔ اس کے بعد گیلے کپڑوں سے گھاٹ پر بیٹھ کر یکسوئی سے جپ کرتے۔ صاف اور میٹھی آواز سے بھیرویں راگنی میں بھجن گاتے ہوئے گھر واپس جاتے۔

میں کہنے کو مسلمان لڑکی تھی۔ لیکن کبھی بھی میں نے اپنے دین کا ذکر نہیں سُنا۔ اور اپنے دین کی عبادت سے بھی جانکار نہیں تھی۔ ان ایام میں عیش و عشرت اور بادہ خوری نے ہمارے گھرانوں میں دینی اعتقاد کو کمزور کر دیا تھا ــــ اور حرم سرا میں بھی مذہب نام تک کو زندہ نہیں تھا۔

قدرت نے شاید میرے جی میں بھی فطری طور پر دینی رغبت پیدا کر ڈالی تھی۔ یا اور کوئی راز نہاں ہوگا میں کہہ نہیں سکتی۔ مگر روزانہ نسیم سحری میں شفق مشرق پر طلوع ہونے والے آفتاب کی روشنی میں نیلگوں جمنا کی سیڑھیوں پر کیسر لعل کے بھجن پوجن کے نظارہ سے فی الوقت میرا بیدار جی ایک بے پناہ ریاضت کی شیرینی سے لبریز ہو جاتا تھا۔

نیک خیالی سے برہمن کیسر لعل کا گورا چھریرا بدن دھوئیں سے عاری چراغ کی لو کی مانند دکھائی دیتا تھا۔ اور برہمن کی بے پناہ عظمت کا جلال اس مسلم خاتون

کے دل کو خمیدہ کر دیتا تھا۔

میری ایک ہندو باندی تھی۔ وہ روزانہ جھک کر نمسکار کر کے کیسر لعل کے پاؤں کی دھول لے آیا کرتی تھی ـــــ یہ دیکھ کر مجھے سرور آتا تھا۔ اور کشش بھی تیج تہوار یا کسی جشن کے دن وہ باندی کبھی کبھی برہمنوں کو کھانا کھلاتی اور دکھشنا دیا کرتی تھی۔ میں خود اُسے روپیہ پیسہ سے مدد دیا کرتی تھی۔ اور کہتی ـــــ "تو کیسر لعل کو مدعو نہیں کرتی تھی" وہ دانتوں میں زبان دبا کر کہتی ـــــ "کیسر لعل مہاراج کسی کا دان دکھشنا اور اَن نہیں لیتے"

اسی طرح کھلم کھلا یا درپردہ کیسر لعل کو کسی طرح بھی اپنی عقیدت نہ دکھا سکنے کی وجہ سے میرا جی عموماً دھر دھکتا رہتا تھا۔ میرے بزرگوں میں سے کوئی جبراً برہمن لڑکی کو بیاہ لائے تھے۔ میں محلوں کے کونے میں بیٹھی اسی خیال میں مستغرق رہا کرتی تھی۔ اور اسی خونی رشتہ سے کیسر لعل کے ساتھ انضباط کا خیال کر کے قدرے سرگرم ہو جایا کرتی تھی۔

اپنی ہندو دائی میں ہندو دھرم کے دھارمک اعتقاد دیوی دیوتاؤں کی عجیب و غریب کہانیاں رامائن اور مہابھارت کی کامل تواریخ بحث و تمحیث سے سنا کرتی تھی ـــــ سنتے سنتے اپنے اس حرم سرا کے کونے میں بھی ہندو سنسار کا ایک عجیب نظارہ میرے ذہن کے سامنے رقص کناں ہو نے لگتا تھا۔ مورتی کے نظارے اور گھنٹہ و گھڑیال کی آواز۔ سونے کے کلس سے زینت افروز دیو مندر۔ دھوپ کی خوشبودار لپٹیں۔ اگر اور چندن کے تلے ہوئے پھولوں کی مہک۔ یوگیوں اور ستیاسیوں کی بے پناہ قوت۔ برہمن کی مقبول عظمت۔ انسانی لباس میں دیوتاؤں

کی طلسم کاری ـــــ یہ سب مِل کر میرے سامنے ایک نہایت قدیم اور وسیع مجازی کائنات کی تخلیق کیا کرتے تھے۔ میرا جی گھونسلہ سے بھٹکے ہوئے چھوٹے سے پرندے کی طرح شام کی مانند کسی بڑے بھاری پر اپنے محل کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں اڑا پھرتا تھا۔ ہندوستان میرے اُس طفلانہ دِل کے لئے نہایت دلچسپ پریوں کی کہانیوں کا مجموعہ بن گئی تھی۔

اتنے میں سرکار کے ساتھ فوج کی لڑائی چھڑ گئی۔ ہمارے چھوٹے سے بدایوں کے قلعہ میں بھی بغاوت کی چنگاریاں دکھائی دینے لگیں۔

کیسر لعل نے کہا ـــــ اب گئو خور گوروں کو بھارت ورش سے دور کر کے ایک بار پھر ہندو مسلمانوں کو حکومت کو حاصل کرنے کے لئے پانسا پھینکنا پڑیگا۔"

میرے والد غلام قادر خان بڑے دانا تھے۔ اُنھوں نے ایک خاص رشتہ دار کے ذریعہ مطلع کیا کہ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ ان سے اُلجھ کر جیت نہیں سکتے۔ میں اُمید موہوم پر اس چھوٹے سے قلعہ کو گنوا نہیں سکتا ــــ میں کمپنی سرکار سے نہیں لڑونگا۔

اس وقت جبکہ ہندوستان کے سارے ہندو مسلمانوں کا خون کھول رہا تھا۔ میرے والد کی اس بنیاپن کی بات پر ہمارا سب کا جی انہیں ملامت کرنے لگا۔ میری بیگم ماں تک پر جوش ہو اٹھی۔

اتنے میں کیسر لعل نے اپنی ہتھیار بند فوج کے ہمراہ آ کر میرے والد سے کہا ـــ نواب صاحب اگر آپ ہمارے ساتھ شامل نہیں تو کم از کم جب تک لڑائی جاری رہیگی آپ کو نظر بند رکھا جاتا ہے۔ میں اس قلعہ کی حفاظت کا بار بھی خود اٹھاتا ہوں۔"

والد نے کہا ـــــ "ہنگامہ بہتر نہیں میں تمہاری ہی طرف ہوں"۔

کیسر لعل نے کہا ـــــ "خزانہ سے کچھ روپے دینے ہوں گے"۔

والد ماجد نے صرف یہی کہا ـــــ "جب جیسی ضرورت ہوگی میں دونگا"۔

سر سے لیکر پاؤں تک میرے جتنے زیور تھے۔ شب کے سب میں نے ایک کپڑے میں باندھ کر اپنی ہمدردی کے ذریعہ کیسر لعل کے پاس بھجوا دیئے۔ انہوں نے میری بھینٹ قبول کرلی میرے زیورات سے عادی اعضا محظوظ ہو اٹھے ـــــ ہر ایک روآں مسرت سے سربلند ہو اٹھا۔

کیسر لعل جنگلی بندوق کی نالی اور پرانی تلواریں صاف کروانے لگے۔ اتنے میں اچانک ایک روز شام کو ضلع کے کمشنر صاحب سرخ لباس والی گوری پلٹن کے ساتھ آسمان میں غبار اڑاتے ہوئے قلعہ میں آدھمکے۔

میرے والد نواب غلام قادر خاں نے پوشیدہ طور پہ انہیں بغاوت کی خبر کردی تھی۔

مگر بدایوں کی فوج پر کیسر لعل کا ایسا رعب تھا کہ وہ اُن کے اشارہ پر خستہ بندوق اور زنگ آلود تلوار دل سے لڑکر جان قربان کرنے کو تیار ہوگئی۔

باپ کا گھر مجھے دوزخ معلوم ہونے لگا۔ غصہ سے دکھ سے نفرت اور حقارت سے میرا سینہ پھٹنے لگا۔ پھر بھی آنکھوں سے ایک بوند تک پانی نہ نکلا۔ اپنے ڈرپوک بھائی کی پوشاک پہن کر میں محل سے باہر نکل پڑی ـــــ کسی کو دیکھنے کی فرصت تک نہ تھی۔

اس وقت گرد و غبار اور سپاہیوں کا شور و غل اور بندوقوں کی آوازیں

—— سب ختم ہو چکی تھیں۔ کرہ ہوائی میں سکرات موت کی سی کیفیت تھی۔ جمنا کے پانی کو خون سے رنگین کرکے آفتاب گوشہ مغرب میں آرام کے لئے جا چھپا تھا۔ شام کی تاریکی میں آسمان پہ آیا ہی چاند کامل طور پر نظر آرہا تھا۔

میدان کارزار موت کے خوفناک نظارہ سے پرخوف ہو گیا تھا۔ اگر اور کوئی وقت ہوتا تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا —— مگر اسوقت میں خواب سے اٹھ کر چل پھر رہی تھی —— تلاش کر رہی تھی —— کہاں ہے کیسر لعل صرف اسکی ایک واحد ذات کے علاوہ اور سب کچھ جھوٹ نظر آتا تھا۔

تلاش و جستجو میں آدھی رات کو میں نے چاند کی روشنی میں دیکھا —— میدان کارزار کے قریب جمنا کے کنارے ایک آم کے باغ میں درخت کے سایہ تلے کیسر لعل اور اس کے بھگت سیوک ہو یا کی نندن کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ سمجھ گئی کہ خوفناکی سے تہہ تیغ ہو کر یا تو نوکر مالک کو یا مالک نوکر کو میدانِ جنگ سے اس بیابان میں لے آیا۔ اور تسکین قلبی سے دونوں نے باہم موت کو لبیک کہی ہے۔

پہلے میں نے اپنی عرصہ کی عقیدت کو شادکام کیا۔ کیسر لعل کے قدموں میں گر کر گھٹنوں تک لٹکتے ہوئے اپنے بالوں کو کھول کر میں نے ان کے پاؤں کی دھول صاف کی۔ اپنے گرم ماتھے پر ان کے ٹھنڈے چرن کنول رکھے —— ان کا بوسہ لیتے ہی میری کافی دنوں کی رکی ہوئی آنسوؤں کی لڑی بہہ نکلی۔

اتنے میں کیسر لعل کا جسم ہلا —— اور اچانک اس کے منہ سے کراہنے کی آواز سن کر میں ان کے پاؤں چھوڑ کر چونک پڑی —— شاید ندی ہوئی

آنکھوں سے اور خشک گلے سے ایک بار بولے ـــــ "پانی"
میں اُسی وقت اپنا دوپٹہ جمنا میں بھگو کر دوڑتی ہوئی آئی۔ کپڑا نچوڑ کر کیسر لعل کے مُنہ میں پانی ٹپکانے لگی۔ اور بائیں آنکھ کو زخمی کرتی ہوئی جو گہری چوٹ لگی تھی۔ اُس جگہ اپنے دوپٹہ کا کونہ پھاڑ کر پانی کی پٹی باندھ دی۔
اُسی طرح کئی کئی بار جمنا سے پانی لا لا کر اُن کے منہ پر آنکھوں پر نچوڑتی رہی ـــــ آہستہ آہستہ ہوش آیا۔ میں نے پوچھا ـــــ "پانی لاؤں؟"
کیسر لعل نے کہا ـــــ "کون ہو تم؟"
مجھ سے رہا نہ گیا بولی ـــــ "یہ داسی آپ کی خادمہ ہے نواب غلام قادر خان کی لڑکی ہوں میں۔ سوچا تھا کہ کیسر لعل مرتے مرتے اپنے بھگت کی آخری ملاقات کرتے جائیں گے۔ اس راحت سے مجھے اب کوئی دُور نہیں کر سکتا"
مجھے پہچان کر کیسر لعل شیر کیطرح گرج کر بولا ـــــ "بے ایمان کی لڑکی! مرتے وقت یون کے ہاتھ کا پانی دیکر تو نے میرا دھرم نشٹ کر دیا"
یہ کہہ کر میرے ماتھے پر داہنے ہاتھ سے بڑے زور سے ایک طمانچہ مارا میں بیہوش سی ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا دکھائی دینے لگا۔
اُس وقت میں سولہ سال کی تھی پہلے دن ہی محل سے باہر نکلی تھی۔ اسوقت تک بیرونی دنیا کی ضیا پاش آفتابی کرنوں نے میرے نرم و نازک رخساروں کی پرکشش رعنائی کو ذرد نہیں کیا تھا۔ اس بیرونی دُنیا میں قدم زن ہوتے ہی دُنیا سے ـــــ اپنی دنیا کے دیوتا سے ـــــ یہی مجھے پہلا آشیرواد ملا۔
اب تک میں بجھی ہوئی سگریٹ کو ہاتھ میں لئے پُرسحر تصویر کی مانند خاموشی

سے بیٹھا ہوا کہانی سن رہا تھا۔ کیسا اندازِ بیان تھا۔ اور کیسا سنگیت تھا۔ یہ پتہ نہیں ——— میرے منہ میں زبان نہیں تھی۔ اتنی دیر بعد پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔ اچانک مُنہ سے نکل پڑا ——— "جانور تھا"

نواب زادی کہنے لگی ——— "کون جانور تھا۔ جانور کیا دم نکلتے وقت مُنہ میں آئی ہوئی شے کو باہر نکال سکتا ہے؟"

میں نے نادم ہو کہ کہا ——— "ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ دیوتا تھا"

نواب زادی نے کہا ——— "کیسا دیوتا۔ دیوتا کیا بھگت کی شردھا بھری بھینٹ کو ٹھکرا سکتا ہے۔"

میں نے کہا ——— "ہاں بات تو درست ہے" کہ کر خاموش ہو گیا۔

نواب کی لڑکی کہنے لگی ——— "پہلے تو میرے دل پر ضرب کاری لگی۔ اور معلوم ہوا جیسے ساری دُنیا اچانک چکنا چور ہو کر میرے سر پر آ رہی ہو۔ لمحہ بھر بعد باہوش ہو کر سخت مشکل سے بے لوث برہمن کے پاؤں کو دور سے پرنام کیا ——— اور جی ہی جی میں کہا ——— اے برہمن تم کمزوروں کے محافظ ہو غیروں کا اناج اور دولتمند کی دولت ہو پُرشباب کا حُسن اور حسینہ کا پریم ہو ——— کچھ بھی قبول نہیں کرتے ؟ تم آزاد ہو۔ غلام ہو۔ واحد ہو۔ بے لوث ہو۔ بہت دُور ہو۔ تمہارے قریب جاکر روح کو سربلند کرنے کا کیا مجھے حق نہیں ہے۔

" نواب زادی کو زمین پر پڑے خمیدہ ہو کر پرنام کرتے دیکھ کر کیسر لعل نے کیا سمجھا میں نہیں کہہ سکتی۔ لیکن چہرہ پر حسرت یا اور کسی قسم کا احساس نہ آیا۔ سکون سے ایک بار میرے مُنہ کی طرف دیکھا پھر آہستہ آہستہ اُٹھے۔ میں نے

لاچارگی سے اُسے آسرا دینے کے لئے اپنے ہاتھ پسار دئے ــــ اُنہوں نے
ندی سے انہیں قبول کر لیا۔ اور بڑی تکلیف سے جمنا کے گھاٹ تک پہنچے۔
وہاں ایک کشتی بندھی تھی۔ کوئی پار جانے والا بھی نہیں تھا۔ اور نہ کوئی پار کرنے
والا اس کشتی پر چڑھ کر کیسر لعل نے رسی کھول دی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے کشتی
منجدھار میں جا پہنچی اور آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میرے
جی میں آنے لگا ــــ کامل طور پر جوشِ شباب سے اس غیر معلوم کشتی کیطرف
ہاتھ جوڑ کر ــــ اُس خاموش کرۂ ہوائی میں۔ چاند کی ماہتابی تجلی سے پُر نور
جمنا میں بے وقعت ٹوٹی ہوئی پھول کی شاخ کی مانند ــــ اپنی اس فضول
زندگی کو بہا دوں۔"

مگر کچھ کر نہ پائی۔ آسمان کے چاند نے۔ جمنا پار کی گھنی کالی لکیر نے اور دریا
کے مصفا پانی نے اور دور کے آموں کے جنگل کے اوپر چاندنی سے جگمگاتے
ہوئے اپنے اس قلعہ کی چوٹی نے ــــ سب نے یکجا طور پر سکوت سے
موت کا راگ گایا۔ عالم سکرات کی سی کیفیت نے مجھے ہر پہلو سے موت کو لبیک
کہنے کی تحریک کی۔ صرف لہروں سے عاری بنے موج جمنا کے سینہ پر تیرتی
ہوئی کشتی۔ اس دُنیا کی دلفریبیوں سے رو گرداں ہو کر وہ کشتی مجھے زندگی کی
شاہراہ کی طرف کھینچ لے چلی۔ میں محبت کے خواب کی مانند مردہ جمنا کے کنارہ
کہیں لمبی لمبی گھاس۔ کہیں خشک ریت۔ کہیں غیر ہموار زمین۔ کہیں گھنے جنگل
اور سنسان بیابان کو چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی"۔

یہاں پر نواب زادی خاموش ہو گئی۔ میں بھی کچھ نہ بولا۔

کافی دیر بعد اُس نے کہا ـــــــ اس کے بعد کا حادثہ نہایت پیچیدار ہے۔ اُسے کسی طرح الگ الگ کر کے صاف صاف کہوں۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ ایک گھنے جنگل میں گئی تھی۔ ٹھیک کس راستہ سے کب کہاں گئی تھی۔ کیا اُسے پھر تلاش کر کے بتلا سکتی ہوں۔ کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کروں۔ کتنا چھوڑ دوں کتنا رکھوں۔ ساری کہانی کو کیسے کس تدبیر سے واضح بنا ڈالوں جس میں کہیں ذرا بھی کچھ مشکل غیر ممکن اور غیر فطری معلوم نہ ہو۔

مگر زندگی کے اُن بے شمار ایام میں سمجھ گئی ہوں۔ کہ ناممکن اور مشکل تو کچھ ہے نہیں۔ نواب کے گھرانے کے محلوں میں بھلا رہنے والی لڑکی کے لئے بیرونی دنیا نہایت پیچیدار ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ہے سب خیالی ـــــــ ایک بار اگر باہر نکل پڑے تو اُسے چلنے کا راستہ مل ہی جاتا ہے نہ یہ راستہ تو اپنی راستہ نہیں ہے مگر ہے ضرور۔ اس راستہ سے آدمی عرصہ بعید سے چلتا آرہا ہے۔ وہ راستہ غیر ہموار اور بے حد طویل ہے۔ وہ کئی شاخوں پہ منقسم ہے۔ رنج و راحت اور مشکلات سے اُلجھا ہوا ہے۔ مگر ہے وہ راستہ ہی۔

اس معمولی انسانی راستہ پہ اکیلی نواب زادی کی طویل مسافرت کی سرگذشت سُننی راحت بخش نہیں ہوگی ـــــــ اور اگر ہو بھی تو ان باتوں کو کہنے کے لئے میرے پاس ذرا بھی حوصلہ نہیں۔ تاہم اس سلسلہ کی ایک بات یہ ہے کہ دُکھ مصیبت آفت۔ عزت اور بے عزتی ـــــــ کافی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر پھر بھی زندگی ناقابلِ برداشت نہیں۔ آتشبازی کی طرح جسقدر جلتی ہوں اتنی ہی تیزی سے گردش پذیر ہوتی ہوں۔ جب تک تیزی سے پھرتی رہی۔ اس وقت تک جل

رہی تھی۔ مگر اس بات کا علم نہیں تھا۔ آج اچانک اس نہایت درجہ نہایت مصیبت نے چراغ کی لو ہوا کے ایک ہی جھونکا سے بجھ گئی ہوں میں بھی راستہ کے ایک طرف بے رُوح وجود کی مانند گر پڑی ہوں —— آج میرا سفر ختم ہو گیا۔ میری کہانی بھی یہاں پہ ہی ختم ہے"۔

اتنا کہہ کر نواب زادی خاموش ہو گئی۔ میں نے دل ہی دل میں سر ہلایا —— اوں ہوں۔ یہاں تو کسی طرح ختم نہیں ہو سکتی۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر میں نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کہا —— بے ادبی معاف کریں۔ آخری دن کی بات ذرا بالتفصیل کہیں تو میرے جی کی گھبراہٹ کچھ حد تک دُور ہو سکتی ہے"۔

نواب زادی ہنسی۔ سمجھ گیا کہ ٹوٹی پھوٹی ہندی کچھ کام کر گئی۔ اگر میں خالص اردو میں بات چیت کر سکتا۔ تو میرے سامنے اُن کا شرم دُور نہ ہوتا۔ بلکہ میں جو اُن کی مادری زبان کو بہت کم جانتا ہوں، یہی ہم دونوں کے درمیان ایک بڑا پردہ تھا۔ —— اور یہی آبرو تھی۔

انھوں نے پھر کہنا شروع کیا —— کیسر لعل کی خبر لگ بھگ مجھے ہمیشہ ملتی رہتی تھی۔ لیکن کسی طرح میں ان سے متقرب نہ ہو سکی۔ وہ تانتیا گروہ میں مِل کر اس باغیانہ سازش سے چھپاتے ہوئے آسمان کے نیچے اچانک کبھی کبھی مغرب اور کبھی مشرق میں بجلی کی مانند ٹوٹ پڑتے اور فوراً ہی گم ہو جاتے۔

میں جب جوگن بن کر کاشی کے شوانند سوامی کو پتا مان کر ان سے سنسکرت شاستروں کا مطالعہ کر رہی تھی۔ بھارت ورش کی ساری خبریں وہاں آیا کرتی تھیں —— میں نہایت بھگتی سے شاستر پڑھتی تھی۔ اور مشتبہ انداز میں دل کو چھید نے

والی لڑائی کی خبریں سُنا کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ انگریز سرکار نے ہندوستان کی بغاوت کی آگ کو پاؤں کے نیچے مسل دیا پھر آسانی سے کیسر لعل کی خبر ملنی بند ہو گئی۔ قیامت خیز آسمان کی سُرخ کرنوں میں بھارت کے مختلف حصص سے جو بہادر آکر دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے ذکر بند ہو گئے۔

اب مجھ سے رہا نہ گیا۔ گورد کا آسرا لیکر بھیروں کے لباس میں نکل پڑی۔ کئی راستے تیرتھ۔ مٹھوں اور مندروں میں پھرتی رہی۔ کہیں بھی کیسر لعل کا پتہ نہ چلا۔ دو ایک کی زبان سے جو اُن کا نام جانتے تھے سُنا ——— وہ یا تو لڑائی میں یا شاہی گرفت میں آکر مارے گئے ہیں۔ میرے دل نے کہا ——— بالکل نہیں، کیسر لعل کی موت تو ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ برہمن شعلہ زن جوالا کبھی بجھ سکتی ہے۔ میری ذاتی قربانی کے لئے اب وہ کہیں مشکل ترین قربان گاہ پر خیابار ہونگے۔

ہندو شاستروں میں لکھا ہے۔ عرفان اور جنت سے شودر برہمن بن سکتا ہے مسلمان برہمن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس بات کا کہیں ذکر نہیں۔ اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ کہ مسلمان اسوقت یہاں تھے ہی نہیں۔ میں جانتی تھی کہ کیسر لعل سے ملاقات میں ابھی کافی دور ہے۔ کیونکہ اس سے قبل مجھے برہمن بننا پڑے گا۔ ایک ایک کر کے تیس برس گذر گئے۔ میں اندر باہر۔ اخلاق اور طرز اطوار سے برہمن بن گئی میری اُس برہمن دادی کا خون میرے جسم میں حرکت زن ہے۔ میں نے دل ہی دل میں آغاز شباب کے برہمن۔ اور اپنے محلات کو۔ اس برہمن کے چرنوں میں بالکل بلا جھجک اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔

باغیانہ جنگ کے زمانہ میں کیسر لعل کی بہادری کے تذکرے سنے۔ مگر وہ میرے دل پر نقش پذیر نہیں ہوتے۔ میں نے اس دن جو اس خاموش چاندنی رات میں جمنا کے سینہ پہ اس کی کشتی پر کیسر لعل کو بہتے دیکھا تھا۔ وہ نظارہ میرے دل پر منقش ہے اس دن رات بھر مندا ہی دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ برہمن اس تاریک رات میں کسی راز دار آخ حقیقت کا پتہ لگانے جا رہا ہے۔ اس کا نہ کوئی مددگار ہے اور نہ خدمت گذار کسی کی بھی اسے کوئی ضرورت نہیں۔ وہ پاک فطرت بزرگ اپنے آپ میں ہی کامل تر ہے آسمان سے سیارے اور تارے جھک کر اسکی کمالیت کے سامنے سرنگوں ہوئے ہے ہیں۔

اسی اثنا میں خبر ملی کہ کیسر لعل حراست سے فرار ہو کر نیپال کیطرف بھاگ گیا ہے میں نیپال پہنچی۔ وہاں کافی عرصہ رہی۔ معلوم ہوا ــــــ کیسر لعل کافی دن ہوئے نیپال چھوڑ کر کسی اور جگہ چلے گئے ہیں۔ ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔

اس کے بعد کئی پہاڑ چھان ڈالے پتہ نہ ملا۔ یہ ہندوں کا ملک نہیں ہے۔ بھوٹانی لوگ بلیچھ ہیں۔ ان کے مشرہ عات بالکل نہیں۔ ان کے دیوتا اور طریق عبادت سب مختلف ہیں ــــــ کافی کوشش سے میں نے جو پاکیزگی حاصل کی تھی۔ مجھے ڈر ہونے لگا کہ کہیں اس پر کوئی لکیر نہ پڑ جائے۔ کوئی داغ نہ لگ جائے۔ میں ہر طرح سے دنیا کی فریب زائیوں سے بچتی رہی ہوں۔ میں جانتی تھی۔ میری کشتی کنارے پر آ پہنچی ہے۔ اور میری زندگی لبوں پر ہے۔

اس کے بعد اور کیا کہوں۔ آخری بات تو نہایت قلیل ہے چراغ جب گل ہوتا ہے تو ایک پھونک سے ہی گل ہو جاتا ہے۔ اس بات کو اب کیسے طوالت دوں

اڑتیس سال بعد اس دارجیلنگ میں آکر میں نے آج سویرے کیسر لعل کو دیکھا ہے
اُسے یہیں خاموش ہوتے دیکھ میں نے عجلت سے پوچھا ــــــ "کیا دیکھا؟"
نواب زادی نے کہا ــــــ دیکھا بوڑھا کیسر لعل بھوٹانی بستی میں بھوٹانی رفیقہ کے ہمراہ اپنے پوتوں کے ساتھ میلے کچیلے کپڑوں میں کھیتی کا کام کر رہا ہے"۔
قصہ ختم ہوا میں نے سوچا اب کوئی تسلی کی بات کہیں۔ کہا ــــــ "اڑتیس برس لگاتار جیسے دن رات جان کی مانند خوف سے دور و دراز رہنا پڑا۔ وہ کس طرح اپنے خیالات اور اخلاق کی نگہداشت کر سکتا تھا؟
نواب زادی نے کہا ــــــ "میں یہ سمجھتی نہیں؛ اتنے عرصہ سے کس محبت سے پھر رہی تھی۔ جس برہمن نے میرے اُبھرتے ہوتے جذبات کو قابو میں کر لیا تھا میں کیا جانتی تھی۔ وہ اثر و تاثر کی جلوہ فرمائی ہے۔ میں خیال کرتی تھی ــــــ وہ دھرم ہے وہ ازلی ابدی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سولہ سال کی عمر میں پہلے پہل گھر سے بے گھر ہو کر عقیدت کے جوش سے لرزتے ہوئے اپنی زندگی کو قربان نہ کر ڈالتی۔ اسے جو دکھ ملا۔ ان کو گورو کے ہاتھ کی رحمت اور بے پناہ عقیدت سے قبول نہ کرتی؛
ــــــ ہائے برہمن تم نے تو اپنی ایک عادت کے بدلے دوسری عادت بدل ڈالی۔ مگر میں اپنی واحد جوانی اور زندگی کے بدلے نئی زندگی اور شباب کہاں سے پاؤں۔
اتنا کہہ کر وہ عورت اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی ــــــ "نمسکار بابو جی"
لمحہ بھر بعد جیسے اپنی غلطی کا ازالہ کر کے پھر بولی ــــــ سلام بابو صاحب،
اس اسلامی طرز طریق سے اُس نے اُس بناوٹی برہمن پن سے آخر وداع پائی۔

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی وہ ہمالیہ کے بھورے بادلوں کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

میں تھوڑی دیر تک آنکھیں موند کر ساری سرگذشت کو اپنے آپ پر مرکوز دیکھنے لگا۔ جمنا کنارے قلعہ کے جھروکے کے قریب مسند پر آرام سے بیٹھی پر شباب نواب زادی کو دیکھا۔ تیرتھ مندر میں آرتی کے وقت اِس عقیدت سے لبریز بھگتنی کو پرسرور پایا اس کے بعد اس دارجیلنگ میں کلکتہ روڈ کے کنارے ایک معزز خاتون کی کہر سے ڈھکی ہوئی نا اُمید صورت بھی دیکھی۔ ایک نوجوان حسینہ میں برہمن پن کا جوش پورے طور پر جوش خیز نظر آیا۔ اور اُردو زبان کے الفاظ میرے افکار ذہنی پر مسلط ہو گئے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اچانک بادل دُور ہو گئے۔ آفتابی کرنوں سے مُصفّا کائنات میں چکا چوند کا عالم تھا۔ رکھشا گاڑیوں میں انگریز عورتیں اور گھوڑوں کی پُشت پہ انگریز مرد سیر کو نکلے تھے۔ بیچ بیچ میں چند ہندوستانی گلے میں گلوبند ڈالے میری طرف کن انکھیوں سے دیکھتے جا رہے تھے۔

میں جلد اُٹھ کھڑا ہوا ---- اس روشن دُنیا میں بادلوں سے ڈھکی ہوئی یہ کہانی مجھے سچی معلوم نہ ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں۔ میں نے پہاڑ کے کہر سے اپنی سگریٹ کا کافی دھواں ملا کر ایک خیالی فسانہ کھڑا کیا تھا۔ وہ مسلمان برہمنی۔ وہ برہمن بہادر جمنا کنارے کا وہ قلعہ۔ کوئی بھی برحق نہیں ہے۔"

ٹیگور

اگرچہ میرا قلم نقش و نگار بناتا ہی رہتا ہے۔ مگر عوام کی خوشنودی میرا شغل نہیں ہے۔ اس لئے لوگ مجھے جس رنگ میں شرابور کہتے ہیں۔ اسمیں سیاہی مایل رنگ غالب رہا کرتا ہے۔ اپنے متعلق کافی کچھ سنتا ہوں لیکن سیاہ بختی کی وجہ سے یہ باتیں مفید معلوم نہیں ہوتیں اور نہ ہی دل کو بہلانے میں معاون۔

جسم پر جہاں چوٹ لگتی ہے وہ کتنا ہی چھوٹا مقام کیوں نہ ہو۔ وہ درد سے سارے جسم میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔ جو آدمی سب و شتم میں ہی تربیت پاتا ہے۔ وہ اپنی عادت کیوجہ سے اسی قسم کی طبعی رغبت پر مجبور ہو جاتا ہے ——— اپنے گرد و پیش کے حالات کے برعکس وہ محو خیال رہا کرتا ہے۔ مگر اسے آرام اور تسکین کہاں ؟ در اصل اپنے آپ کو فراموش کرنے میں ہی راحت ہے۔ اس لئے مجھے

ہر وقت خاموش کدہ ہوائی کی جستجو رہتی ہے۔ لوگوں کے ہچکولوں سے جسم میں جو جو مقام پچک گئے ہیں وہ فطرت کی خدمت گذار گردش کے صفات سے تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔

کلکتہ میں دور تر میرے لئے کنج تنہائی مخصوص ہے۔ وہاں ہی میں اپنی ذاتی کشمکش میں محو پرواز رہا کرتا ہوں۔ وہاں کے لوگ اور باغ و بہار اسوقت تک میرے متعلق کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے۔ انہوں نے دیکھا میں ہوس کا غلام نہیں۔ دیہات کی شب پاکیزہ کو کلکتہ کی سیاہی سے خراب نہیں کرتا۔ مرتاض بھی نہیں ہوں کیونکہ دور و نزدیک سے میرا جو ذکر سنتے ہیں اس میں میری دولتمندی کا تذکرہ پنہاں ہوتا ہے۔ راہ گیر مسافر نہیں ہوں۔ مگر گاؤں کی پگ ڈنڈیوں کے چکر ضرور کاٹتا ہوں۔ اور کہیں پہنچنا میرا مقصد نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ میں خانہ دار ہوں کیونکہ انہیں اس امر کا ثبوت نہیں مل سکا۔ کہ میرے گھر کوئی آدمی بھی ہے۔ اس لئے وافقکار لوگوں کی جماعت کے کسی زمرہ میں شمار نہ ہونے کیوجہ سے گاؤں کے لوگوں نے میرے متعلق غور و فکر چھوڑ دیا ہے ——— اور میں بھی بے فکر ہوں۔

چند روز ہوئے خبر ملی۔ اس گاؤں میں ایک شخص نے میرے متعلق کوئی رائے درست حد تک قائم کر لی ہے۔ کم از کم اس نے مجھے بے وقوف نہیں سمجھا۔

اس کے ساتھ پہلی ملاقات ہوئی۔ ہاڑ کی حدت آمیز شام تھی۔ آہ و فغان کے بعد جس طرح پلکوں کی نم آلودگی ہوا کرتی ہے۔ وہی جذبات علی الصبح کی بارش کے ختم ہونے پر باغ کی آب و گل سے متشابہ رنگ کے مجھ میں پائے جاتے تھے۔ اپنے تالاب کے کنارے میں بلندی سے ایک سیاہی مائل رنگ کی گائے کو ترم و

نازک گھاس چرتے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ملائم جسم پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ آفتابی حرارت سے محفوظ رہنے کے لئے تہذیب نے جو اس قدر درزیوں کی دوکانیں کھول رکھی ہیں۔ اس سے بڑھ کر فضول خرچی اور کیا ہو گی۔

فی البعد اچانک کیا دیکھتا ہوں۔ ایک متوسط درجہ کی عورت جھک کر نمسکار کر رہی ہے۔ اُس کے آنچل کے دونے میں کیسر اور گندراج وغیرہ کے پھول بندھے ہیں ان میں سے ایک پھول نکال کر وہ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے نہایت عقیدتمندی سے بولی ——— "یہ میں نے اپنے ٹھاکر کو دیا" ——— کہہ کر چلی گئی۔

میں کچھ اس قدر حیرت زدہ ہو گیا۔ کہ اُسے اچھی طرح دیکھ بھی نہ پایا۔

یہ واقعہ بہت معمولی تھا۔ لیکن کچھ ایسے انداز میں رونما ہوا کہ وہ گائے جو شام کی نرم نرم آفتابی شعاعوں میں دُم ہلا ہلا کر مکھیوں کو اُڑاتی ہوئی لمبے لمبے سانس لے کر تازہ تیکھی نرم و نازک گھاس کو تسکین سے چرتی ہوئی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اسکی زندگی مجھے بڑی پُر لطف معلوم ہوتی۔ یہ بات سُن کر کچھ لوگ مسکرانے لگیں گے۔ لیکن میرے جذبات سچے معنوں میں چھلک رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے زندگی بخش بارگاہ میں سر جھکا دیا۔ باغیچہ کے آم کے پیڑ سے ایک برگ سمیت آم توڑ کر میں نے گائے کو کھلا دیا۔ مجھے محسوس ہوا۔ میں نے دیوتا کو خوش کر دیا ہے۔

اس کے دوسرے برس جب میں وہاں پہنچا اُس وقت سردی کا اختتام تھا۔ ٹھنڈک پڑ رہی تھی۔ صبح کی دھوپ کھڑکی کے راستہ داخل ہو کر میرے جسم پر کرنیں بکھیر رہی تھی۔ میں دوسری منزل پر کچھ لکھ رہا تھا۔ کہ اسی وقت نوکر نے آکر خبر دی کہ آنندی وشنوی مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ مجھے خبر نہیں وہ کون ہے۔ متحیر ہو کر

بولا ــــ "اچھا انہیں بلا لاؤ"

ویشنوی نے میرے پاؤں کی دھول اٹھا کر پرنام کیا۔ میں نے دیکھا وہی میری پہلی جانکار عورت ہے۔ وہ خوبصورت ہے یا نہیں۔ یہ بات معلوم کرنا اُسکی عمر کے لحاظ سے غیر ضروری ہے۔ دوہرا جسم۔ عام عورتوں سے لمبا ایک فطری عقیدت سے ملائم تاہم پُرجوش اور بے خوف۔ سب سے پہلے اُس کی آنکھوں پر ہی توجہ پڑتی ہے کیسی پوشیدہ قوت سے اس کی یہ بڑی بڑی آنکھیں جیسے کسی دور کی شے کو نزدیک کر کے دیکھ رہی ہیں۔

اپنی ان دونوں آنکھوں سے دھکا دیکر اُس نے کہا ــــ "اچھا۔ بھلا تم نے یہ کیا گناہ کیا؟ مجھے اس تخت شاہی کے سامنے حاضر ہونے سے کیا فائدہ؟ تمہیں درخت کے نیچے دیکھا کرتی تھی۔ کیا ٹھیک تھا۔

میں سمجھ گیا درخت کے نیچے اس نے مجھے کافی بار دیکھا لیکن میں نے اسے بالکل نہیں دیکھا۔ کئی دنوں سے کچھ زکام ہو گیا تھا۔ اس لئے شاہراہوں اور باغیچوں میں لطف حاصل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ چھت کی بلندی پر شام کے آسمان کے ساتھ مقابلہ کیا کرتا ہوں۔ اس لئے اس نے کئی دنوں سے مجھے کہیں دیکھا نہیں ہے۔

ذرا جھجک کر بولی ــــ "مہاراج! مجھے کچھ اُپدیش دو۔"

میں الجھن میں پڑ گیا۔ بولا ــــ میں کچھ اُپدیش دے بھی نہیں سکتا۔ لے بھی نہیں سکتا۔ آنکھ موند کر خاموشی سے جو کچھ پا لیتا ہوں۔ اسی کے بھروسہ میرا کاروبار چلتا ہے۔ جو یہ کچھ کر رہا ہوں اسی سے مجھے نظر آرہا ہے۔ اور سُن بھی رہا ہوں۔"

وشنوی نہایت مسرت سے۔ پربھو۔ پربھو۔ کہ اُٹھی۔ پھر بولی ـــــــ "بھگوان کے پاس صرف لذت اندوزی کی قوت ہی نہیں بلکہ وہ ہر ایک اعضا سے محو تکلم رہتے ہیں!"

میں نے کہا ـــــــ "خاموشی کے باوجود اُس کے ہر ایک عضو سے دلکش گفتار سنائی دیتی ہے۔ اُسکو سننے کے لئے ہی شہر سے دور یہاں آیا کرتا ہوں"۔

وشنوی نے کہا ـــــــ "میں یہ سمجھ گئی ہوں۔ اسلئے تمہارے قریب آ بیٹھی ہوں"
واپسی کے وقت جب وہ میرے چرنوں کی دھول لینے لگی۔ تو میں نے دیکھا کہ میرے موزوں پر ہاتھ لگانے سے اس کو کافی ہچکچاہٹ ہوئی۔

دوسرے دن سویرے طلوع آفتاب سے قبل ہی میں مسقف بلند پر جنوبی سمت کی طرف باغیچہ کے جھاؤ کے پیڑوں سے جہاں تک نظر کام کرتی تھی میدان شائیں شائیں کر رہا تھا۔ جب سے یہاں رہنے لگا ہوں۔ اُسوقت سے روزانہ بانس کے جنگل سے گھیرے ہوتے گاؤں کے نزدیک جو گنے کا کھیت ہے اُسی سمت سے آفتاب طلوع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ گاؤں کا راستہ گھنی چھایا سے یکایک نکل کر کھلے میدان کے درمیان سے گذرتا ہوا۔ اُلٹا سیدھا دُور کے گاؤں تک چلا گیا ہے آفتاب نکل آیا۔ یا نہیں۔ ایک سفید کہر کی چادر بیوہ کے نقاب کی مانند گاؤں کے درختوں پر چھاگئی۔ میں نے دیکھا۔ وشنوی اُسی علی الصبح کی دُھندلی روشنی میں خاص انداز سے چلتی ہوئی تصویر کی مانند کھڑتال بجاکر ہری کیرتن کرتی ہوئی اُس مشرقی سمت کے گاؤں کی طرف چل پڑی ہے۔

توجہ ٹوٹنے پر جس طرح آنکھوں کی پلکیں کھل جاتی ہیں۔ اُسی طرح کہر ایک

طرح سے اُٹھ گیا۔ اور سارے مکان اور میدان کے درمیان دھوپ اس طرح سے آکر بیٹھ گئی جس طرح گاؤں کے بوڑھے دادا آکر ڈیرہ جما بیٹھتے ہیں۔ میں اُس وقت ایڈیٹر کے چپڑاسی کو واپس کرنے کے لئے لکھنے کی میز پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ کے ساتھ گانے کی سُر سنائی دی۔ ویشنوی گنگناتی ہوئی آئی۔ مجھے پرنام کرکے کچھ دُور ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں نے لکھنا بند کرکے سر اُٹھایا۔

وہ بولی ــــ "میں نے کل تمہارا پرساد پایا تھا۔

میں نے کہا ــــ "وہ کیا؟"

اُس نے کہا ــــ "کل شام کو میں اس بھروسے بیٹھی تھی۔ کہ اب تمہارا کھانا ہوگا۔ جب آپ طعام تناول کر چکے اور نوکر برتن لیکر باہر آیا۔ اس میں کیا تھا ــــ مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے کھا لیا تھا۔"

میں متحیّر ہو گیا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کہ میں ولائیت سے واپس آیا ہوں۔ وہاں کیا کھایا ہے۔ کیا نہیں کھایا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن اگر میں نے گوبر تو نہیں کھایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کافی عرصہ سے گوشت یا مچھلی کھانے کی رغبت نہیں البتہ میرے رسوئیئے کی ذات پات کی بات علیٰ الاعلان نہ کرنا بہتر ہے۔ میرے چہرہ پر حیرت ناک احساسات کو دیکھ کر ویشنوی نے کہا ــــ "اگر آپ کا پرساد نہیں کھا سکونگی۔ تو تمہارے قریب آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

میں نے کہا ــــ "لوگ یہ بات جان کر عقیدت مندانہ جذبات کھو بیٹھیں گے۔"

اس نے جواب دیا ــــ "میں سب سے کہتی پھرتی ہوں۔ یہ لوگ سُن کر سوچتے

ہیں۔ کہ میری حالت ہی ایسی ہے"۔

اس سے قبل وشنوی جس گرہستی زندگی میں تھی۔ اُن کے متعلق میں اس کے منہ سے کچھ سُن نہ سکا۔ صرف یہی جان سکا۔ کہ اس کی ماں کی حالت اچھی ہے۔ اور وہ ابھی تک زندہ ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اُس کی لڑکی سے لوگوں کو عقیدت ہے اُسی کی خواہش ہے۔ کہ لڑکی وہیں رہے۔ لیکن آنندی کا دل اس امر کی شہادت سے معذور ہے

میں نے پوچھا ـــــ تمہارا گذارہ کیسے ہوتا ہے؟"

جواب میں سُنا کہ اُس کے محبوں سے کسی نے اُسے تھوڑی سی زمین دیدی ہے اس سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے۔ اُس سے اس کی گذر ہوتی ہے۔ اور پانچ افراد اور بھی کھا لیتے ہیں۔ پھر بھی وہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ کہہ کر وہ ذرا مسکرائی اور کہنے لگی ـــــ میرے پاس تو سب کچھ تھا ـــــ سب چھوڑ آئی ہوں۔ اور پھر بھی دوسروں سے مانگ مانگ کر اکٹھا کرتی ہوں۔ اچھا اس کی کیا ضرورت تھی۔ کہو تو سہی۔"

میں اگر شہر میں ہوتا اور یہ سوال پیدا ہوتا تو آسانی سے نہ چھوڑتا۔ بھکارمن کے روزگار نے سماج کو کسقدر شرمندہ کیا ہے یہ تو سمجھا مگر یہاں پہنچ کر ہماری کتابیں اور اُن کی تعلیم سب کند ہو کر رہ جاتی ہے۔ وشنوی کے منہ سے میرے سامنے کوئی آواز تک نہ نکلی ـــــ میں خاموش رہا میرے جواب کی انتظار کے بعد وہ خود بخود بول اُٹھی ـــــ "نہیں نہیں یہی میرے لئے بہتر ہے مانگ کر جو کھاتی ہوں وہی کھانا میرے لئے بہتر اور مفید ہے"

میں اُس کے کہنے کا مطلب سمجھ گیا۔ جو بھگوان روزانہ کھانے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ خیرات کے کھانے سے بھی اُن کی یاد آتی ہے۔ اور گھر کے کھانے سے پتہ

لگتا ہے کہ یہ میرا ہی کھانا ہے میں اسے تناول کر رہا ہوں۔
خواہش تھی۔ کہ اُس کے خاوند کے متعلق دریافت کروں۔ لیکن اُس نے خود بخود انکار کر دیا۔ میں نے بھی دریافت نہ کیا۔
اس گاؤں میں اعلیٰ ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ اُن کے لئے وشنوی کے جی میں ذرا بھی عقیدت نہیں پائی جاتی۔ کہتی ہے وہ لوگ ٹھاکر کو کچھ نہیں دیتے لیکن اسکے باوجود ٹھاکر بھوگ میں سب سے زیادہ حصّہ لے بیٹھتے ہیں غریب بیچارے بھگتی کرتے اور فاقہ میں مرتے ہیں۔
اُس محلہ کی چپلقش کی کافی باتیں سُنی ہیں۔ اس لئے بولا ——" ان بے عقل لوگوں کو سمجھاؤ۔ اسی سے بھگوان کی خدمت ہو سکے گی "
میں نے اس قسم کے بیش قیمت اُپدیش کافی سُنے ہیں۔ وہ دوسروں کو سنانے میں مجھے مزا بھی آتا ہے لیکن وشنوی اس سے متحیر نہیں ہوتی۔ میرے منہ کیطرف اپنی دونوں روشن آنکھیں گاڑ کر وہ بول اُٹھی —— " تم کہتے ہو بھگوان پاپی میں بھی رہتے ہیں۔ اس لئے ان کا ساتھ کرنے سے بھی اُن کی ہی عبادت ہوتی ہے۔ یہی نا؟
میں نے کہا —— ہاں "
وہ بولی —— " جب یہ لوگ زندہ ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں تو بضرور ان میں بھگوان موجود ہیں۔ اس میں شُبہ کا احتمال نہیں ہے؟ لیکن میری پوجا سے وہاں کچھ بن نہیں سکا —— میرے بھگوان تو ان میں نہیں ہیں۔ وہ جہاں ہیں میں وہاں بھی اُن کی تلاش میں محو ہوں " —— کہہ کر اُس نے مجھے پرنام کیا۔ اُس کے

کہنے کا یہ مطلب تھا۔ کہ صرف عقیدہ کو لے کر کیا ہوگا۔ سچائی کی ضرورت ہے۔ بھگوان حاظر و ناظر ہیں۔ یہ ایک عقیدہ ہے ——— مگر جہاں میں انہیں دیکھوں وہاں ہی وہ میرے لئے "موجود" ہیں۔

اگرچہ بیکار ہیں۔ اس کے باوجود کسی کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرے تقریب میں ویشنوی جو عقیدت بجا لاتی ہے۔ میں اُسے قبول اور رد بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے موجودہ زمانہ کی چھوت لگی ہے۔ گیتا پڑھا کرتا ہوں۔ اور عالموں کی دریوزہ گری کر کے دھرم کے رموز کی کافی تشریحات سُن چکا ہوں سنتے سنتے پیمانہ عمر لبریز ہو رہا ہے۔ لیکن کہیں بھی علمی مشاہدہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ کافی دنوں کے بعد اپنی آنکھوں کا غرور چھوڑ کر اس کتب متبرکہ سے ناواقف عورت کی آنکھوں کے اندر سچائی کو دیکھ پایا۔ بھگتی کے بہانے ہدایت دینے کا یہ کیسا عجیب طریقہ ہے۔

دوسرے دن سویرے ویشنوی جب مجھے پرنام کرنے آئی۔ تو میں اُس وقت بھی لکھنے میں سر مست تھا۔ وہ قدرے چڑ کر بولی ——— "تم سے میرے بھگوان کیوں اس قدر مشقت کرا رہے ہیں۔ جب آتی ہوں لکھتا ہی پاتی ہوں۔"

میں نے کہا ——— "جو آدمی بیکار محض ہوتا ہے۔ بھگوان اُسے خاموش نہیں بیٹھنے دیتا۔ خاموش بیٹھنے سے اس کے مٹی میں مِل جانے کا اشتباہ ہوتا ہے۔ جسقدر بے مصرف کے کام ہیں۔ اُن سب کا بار اُس پر ڈال دیتا ہے۔

مجھے بے شمار پردوں میں ڈھکے رہتے دیکھ کر وہ لاچار ہو جاتی تھی۔ میرے پاس آنے پر پہلے حکم لینا پڑتا ہے۔ پھر دوسری منزل پر چڑھنا پڑتا ہے۔ پرنام

کرتے ہوئے ہاتھ موڑوں پر لگ جاتے ہیں۔ پھر اُسے دو سیدھی سادھی باتیں کرنی ہوتی ہیں اور میرا جی کسی مضمون میں غرق ہوا کرتا ہے۔

وہ دست بستہ بولی۔ بھگوان! آج صبح کو جونہی بستر سے اٹھی آپ کے چرنوں کو پا گئی۔ آپ کے دونوں پاؤں کسی چیز سے ڈھکے ہوئے تھے ——— وہ کس قدر خنک تھے۔ اس قدر نازک! کتنی دیر تک تو میں انہیں سر پہ لگاتے رہی پر بھوا یہ میری محبت نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ؟"

میری لکھنے کی میز پر پہلے دن کے کچھ باسی پھول تھے۔ گلچیں آیا انہیں نکال کر تازہ پھول سجانے لگا۔ ویشنوی قدرے جھلا کر بول اٹھی ——— بس! یہ پھول اب ختم؟ تمہیں اب ان کی ضرورت نہیں ہے۔ تو پھر دیدو۔ مجھے دیدو" ———

یہ کہہ کر اس نے پھولوں کو نازک ہاتھوں میں لے اور کافی دیر تک انہیں محبت سے نہارتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد منہ اٹھا کر بولی ——— تم ان کی طرف نہیں دیکھتے اس لئے یہ پھول تمہارے پاس مرجھا جاتے ہیں۔ جب ان کی طرف دیکھو گے۔ تو لکھنا پڑھنا سب بھول جاؤ گے"۔

یہ کہہ کر اس نے بڑی ہوشیاری سے پھولوں کو آنچل میں باندھ لیا۔ انہیں پیشانی سے لگاتی ہوئی بولی ——— "اپنے ٹھاکر کو میں لے جاتی ہوں"۔

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ صرف پھولدان میں ہی رکھ دینے سے پھول سے عقیدت نہیں ہوتی مجھے معلوم ہوا کہ سکول میں پڑھنے والے بچوں کی مانند میں پھولوں کو بنچ پہ کھڑا کر سکتا ہوں۔

اسی دن شام کو میں چھت پر بیٹھا تھا۔ ویشنوی آکر میرے قدموں کے قریب

بیٹھ گئی۔ بولی ــــ "آج سویرے پربھو کیرتن کے وقت تمہارے پھولوں کو گھر گھر بانٹ آئی ہوں۔ میری بھگتی دیکھ کر بینی چکرورتی مسکرا کر بولا۔ پگلی تو کس کی بھگتی کر رہی ہے۔؟ دنیا تجھے بُرا کہے گی۔ ہاں جی سُنا ہے تمہیں سب لوگ گالی دیتے ہیں۔"

صرف ایک لمحہ کے لئے میرا جی سکڑنے لگا۔ سیاہی کے دھبے کافی دُور تک پھیلتے گئے۔

ویشنوی بولی ــــ "بینی نے خیال کیا تھا۔ کہ میری بھگتی کو ایک پھونک سے ہی بجھا دیگا۔ یہ تیل کی بتی نہیں آگ ہے آگ، اچھا میرے بھگوان وہ آپ کو گالی کیوں دیتے ہیں بھلا۔"

میں بولا ــــ "میری تلاش ہے اس لئے۔ خوب ہے ممکن ہے میں نے چوری سے انکا ایک دن جی چُرا لیا تھا۔"

ویشنوی نے کہا ــــ "آدمی کے جی کا زہر کس قدر ہے۔ یہ تو آپ دیکھا ہی ہے؟ لالچ دیر پا نہیں ہوتا۔"

میں بولا ــــ "جی کے لالچ کیوجہ سے ہی سانپ کے مُنہ میں جانا پڑتا ہے۔ اور اپنے آپ کو تباہ کرنے کا کام آدمی خُود بخود ہی تیار کرتا رہتا ہے۔ اس لئے میرے چنچل من کو خواہشات سے بالکل بُری کرنے کے لئے سخت جھاڑ پھونک کر رہے ہیں۔"

ویشنوی بولی ــــ "بھگوان مارتے مارتے سانپ کا کچومر نکالتے ہیں۔ آخری دم تک جو مار کھا سکتا ہے۔ وہی بچ رہتا ہے۔"

ابھی رنگِ شام کی تاریکی چھت اور آسمان کی بلندی پر انجم رخشاں سے دمک کر خاموش ہوگئی .... ویشنوی نے اپنی زندگی کا فسانہ مجھے سنایا۔

میرے شوہر سیدھے سادے آدمی تھے۔ چند ایک کا خیال تھا۔ کہ ان میں سمجھنے کی قوت کم ہے لیکن میں جانتی ہوں جو عجلت میں سمجھنا چاہتے ہیں وہ باہمی طور پر ٹھیک سمجھتے ہیں۔

جب انہوں نے بھی دیکھا اپنی کھیتی باڑی۔ زمین جائداد کے معاملہ میں وہ بعض اوقات ٹھگے جاتے تھے۔ گھر باہر کے تمام کام باسلیقہ ہوا کرتے تھے۔ دھان چاول وغیرہ کا جو ادنےٰ سا بیوپار کرتے تھے۔ اس میں کبھی نقصان نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ وہ لالچی نہیں تھے۔ حسبِ ضرورت وہ حساب سے چلتے۔ اس سے زیادہ وہ کبھی بھی نہیں بنتے۔ میری شادی سے پہلے ہی میرے سسر کا انتقال ہوگیا تھا۔ چند دنوں بعد ساس بھی راہیٔ ملکِ عدم ہوگئی۔ دنیا میں سر پر کوئی محافظ نہیں تھا۔ میرے شوہر کو کسی کی معاونت کے بدوں چارہ نہیں تھا۔ یہ کہتے شرم آتی ہے کہ میری عقیدت ایسی کرتے تھے۔ تاہم میرا یقین ہے کہ وہ میرے سے زیادہ دانا تھے۔ اور میں زیادہ باتونی تھی۔

اُن کے ایک گرو جی تھے۔ ان کی وہ سب سے زیادہ عقیدت بجا لاتے تھے بھگتی نہیں پریم کرتے تھے .... اس قسم کا پریم بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ گرو جی عمر میں ان سے قدرے کم تھے۔ اُن کا کیسا روپ تھا۔

لمحہ بھر یہ کہتے ہوئے ویشنوی رُک گئی۔ اپنی تیز تر توجہ کی گہرائی میں ڈوب کر وہ گنگنانے لگی۔

اس گوردجی کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلتے رہے تھے۔ اُس وقت سے ہی جی جان فدا کر چکے تھے۔ گوردجی میرے شوہر کو بے وقوف ہی خیال کرتے تھے۔ اس لئے ان پر ظلم بھی کرتے۔ اپنے ہمراہیوں سے ملکر ان کا ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔

جب میں شادی کے بعد سسرال آئی تو گوردجی نے نہیں دیکھا۔ وہ اسوقت پڑھنے کے لئے کاشی چلے گئے تھے۔ میرا شوہر ہی اخراجات ادا کرتا۔ جب گوردجی گھر واپس آئے میں خیال کرتی ہوں کہ میرا اٹھارہ کا سن تھا۔

پندرہ سال کی عمر میں میرے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ کچی عمر تھی، اس لئے لڑکے کی پرورش سیکھی نہیں تھی۔

اردگرد کی ہمجولیوں سے ہی ملنے کو جی دوڑتا تھا۔ لڑکے کی وجہ سے گھر میں پڑی رہتی۔ اس لئے قدرے اس پر بھی مجھے دانت پیسنے پڑتے۔

ہائے رے! لڑکا جب پیدا ہو چکا تھا۔ تو بھی ماں پیچھے رہ گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی ہے۔ میرا گوپال آیا۔ آکر دیکھا کہ ان کے لئے ابھی تک مکھن تیار نہیں تھا۔ اس لئے ناراض ہو کر چلا گیا——میں آج بھی برہم ہستی میں اس کی تلاش میں محو ہوں۔

لڑکا باپ کی آنکھوں کا نور تھا۔ میں اس کے لئے کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس لئے اُس کے باپ کو تکلیف ہوتی تھی۔ مگر چونکہ اُس کا دل بے زبان تھا—— آج تک اس کی تکلیف کا ذکر کسی سے کہہ نہیں سکی

لڑکے کی وہ ماں کی مانند پرورش کرتے تھے۔ رات کو اگر روتا تو میری کچی عمر

کی نیند وہ اُچاٹ نہیں کرتے تھے۔ جب کبھی وہ رات کو اُٹھتے دُودھ گرم کر کے اُسے پلاتے پھر تھپک تھپک کر سُلا دیتے۔ مجھے خبر ہی نہیں ملتی تھی۔ اُن کا سارا کام اسی طرح کی خاموشی سے ہوا کرتا تھا۔ تیج تہوار کے وقت زمیندار کے گھر کھیل اور ناٹک ہوتا تو کہتے۔ شب باشی نہیں ہو سکتی۔ تم جاؤ میں یہاں رہتا ہوں " وہ اگر لڑکے کو نہ لیتے تو میرا جانا مشکل ہوتا۔ اس لئے انکا یہ بہانا ہوا کرتا تھا۔

حیرت تو یہ ہے کہ لڑکا اس کے باوجود مجھ سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ یعنی یہ خیال کرتا تھا۔ کہ موقع ملتے ہی میں اُسے پھینک کر بھاگ جاؤں گی۔ اس لئے جب وہ میرے پاس ہوتا تو بھی ڈرتا رہتا۔ اُس نے مجھے کم ہی پایا تھا۔ اس لئے میرے تقرب کی خواہش اس میں ہر وقت بیدار رہتی تھی۔ میں جب نہانے کو تالاب پر جاتی تو وہ ہمیشہ مجھے تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ میری سہیلیوں سے ملنے کی جگہ تھی وہاں لڑکے کو لیکر اسکی خبر گیری کرنا میرے لئے دو بھر تھا۔ اس لئے جہاں تک بس چلتا میں اُسے لے نہیں جاتی تھی۔

ساون کا مہینہ تھا۔ گھنے بادل جوش سے دوپہر میں آسمان پر چھاتے جا رہے تھے۔ میں نہانے جا رہی تھی۔ لڑکے نے رونا شروع کیا۔ نستارنی ہماری رسوئی کیا کرتی تھی۔ اُسے کہتی گئی۔ ذرا اللو کو دیکھنا تو بیٹا میں ایک ڈبکی لگا کر ابھی آئی "

اس وقت گھاٹ پر اور کوئی نہیں تھا۔ سہیلیوں کی انتظار میں تیرنے لگی تالاب پُرانے زمانہ کا تھا۔ نہ معلوم کس رانی نے اسے کب بنوایا تھا۔ اسلیئے نام تھا "رانی ساگر" تیر کر پار ہونا سب لڑکیوں سے مجھے ہی آتا تھا۔ برسات سے اس وقت تالاب لبالب بھرا ہوا تھا۔ جب آدھا تالاب پار کر چکی تو پیچھے

سے آواز آئی ، ماں ، پھر دیکھتی ہوں کہ للو گھاٹ کی سیڑھیوں پر اترتے اترتے مجھے پکار رہا ہے ۔ چلا کر بولی " آگے مت بڑھ میں آئی ، میں جوں جوں منع کرتی وہ ہنستا ہوا بڑھتا آیا ۔ ڈر سے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے ۔ جس قدر ہمت کرتی گھاٹ پر آنا مشکل ہو رہا تھا ۔ آنکھیں بند کر دیں ۔ نامعلوم کیا دیکھنا پڑے ٹھیک اسی لمحہ اس تھراتے ہوئے گھاٹ پر للو کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ۔ پار ہو کر ماں کی گود میں محبت کو نہ پانے والے ۔ بچہ کو پانی سے اٹھا کر گود میں لیا ۔ لیکن اس نے ماں کہہ کر پھر نہیں پکارا ۔

میں نے اپنے گوپال کو اتنے دن ناراض کیا تھا ۔ وہ تمام ناراضگی میری طرف بڑھ کر مجھے مارنے لگی ۔ جب وہ زندہ تھا تو بضرورت میں اسے چھوڑ کر چلی جاتی تھی ۔ اس لئے ابھی تک دن رات وہ میرے جی کو زور سے پکڑے ہوتے ہے ۔

میرے شوہر کو کس قدر چوٹ لگی ۔ وہ ان کا جی ہی جانتا ہے اگر وہ مجھے گالیاں دیتے تو بہتر تھا ۔ مگر وہ تو صرف برداشت کرنا ہی جانتے تھے ۔ کہنا بالکل نہیں ۔

اسوقت جب ایک طرح سے پاگل ہو گئی تھی ۔ گورو جی گھر واپس آ گئے تھے ۔ بچپن میں جب میرا شوہر گورو جی سے کھیلتا کودتا تھا ۔ اسوقت اور ہی فطرت تھی ۔ اب کافی عرصہ کے تھپیڑوں کے بعد عادت میں فرق آ گیا تھا ۔ ان کے طفولیت کے رفیق ولایت سے بھی پھر آئے تھے ۔ آج کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اسوقت کے ہمدم ہیں وہ ان کے سامنے زبان تک وا نہیں کر سکتے تھے ۔ شوہر نے مجھے دلاسا دیکر گورو جی سے اصرار کیا ۔ گورو جی نے مجھے شاستر سنانا شروع کیا ۔ یہ تو یاد نہیں کہ ان باتوں سے کوئی خاص فائدہ ہوا ۔ میرے نزدیک ان کے الفاظ کی اسقدر قیمت تھی ۔ کہ ان کے

منہ سے سُنا ہے۔ انسانی زبان سے ہی بھگوان آدمی کو آبحیات پلاتے ہیں ——
اُن سے ایسا کون ہے جو مستفید ہوتا ہے۔ پھر وہ تو انسانی زبان سے ہی امرت پلاتے ہیں۔

گورو سے میرے شوہر کی لاانداز عقیدت نے ہماری دُنیا کو "مدھوچکرہ" کی مانند شیریں کر رکھا تھا۔ ہمارا کھانا پینا اُن کی عقیدت سے شرابور تھا۔ میں اسی نشہ میں کلہم ڈوبی رہتی تھی۔ اسی لئے مجھے تسکین ملی۔ اس لئے کہ دیوتا کو میں نے گورو کی شکل میں دیکھا تھا۔

روزانہ صبح کو صرف یہی یاد آتا کہ وہ آکر بھوگ لگائیں گے۔ اور ہم پرساد لیں گے میں اسی تیاری میں لگ جاتی اُن کے لئے سبزی کاٹتی تو انگلیوں سے مسرت کی تان نکلتی۔ برہمنی نہ ہونے کی وجہ سے میں انہیں اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کر کے کھلا نہیں سکتی تھی۔ اس لئے میری ساری بھوک نہیں ہٹتی تھی۔

وہ معرفت کے سمندر تھے —— انہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ میں معمولی عورت انہیں ذرا کھلا پلا کر خوش کر سکتی تھی۔ اس میں بھی ہر طرف سے اسقدر رکاوٹیں۔

میری گورو سیوا سے شوہر کا جی مسکراتا اور مجھ سے عقیدت اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ جب دیکھتے کہ شاستر سُنانے میں گورو جی کا میری طرف خاص خیال ہے۔ گورو سے اپنی کم عقلی کیوجہ سے انہیں یقین ورثہ میں نہیں ملا لیکن پھر بھی یہ خوش بختی ہے کہ ان کی رفیقہ نے اپنی عقل کے زور سے گورو کو خوش کر لیا ہے۔

چار یا پنچ برس کس طرح گذر گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔
ساری زندگی اسی طرح گذر گئی۔ کچھ سمجھ نہیں سکی۔ میں اسکو پہلے بھانپ نہ سکی۔

دلوں کے والی نے پکڑ لیا۔ اُس کے بعد ایک ہی ساعت میں سب الٹ پلٹ گیا
اُس روز پھاگن کی صبح تھی۔ گھاٹ کے راستہ کے درختوں کے سایہ سے
واپس آرہی تھی۔ گیلا کپڑا جسم سے چپکا ہوا تھا۔ راستہ کے موڑ پر ایک آم کا درخت
تھا۔ وہاں گوروجی سے ملاقات ہوئی۔ وہ کندھے پہ کوئی کپڑا لئے ورد کرتے
تالاب پہ نہانے جارہے تھے۔

گیلے کپڑوں میں ہونے کیوجہ سے شرم آئی۔ ایک جانب سے سر کترانا چاہتی
تھی۔ کہ انھوں نے میرا نام لیکر پکارا۔ میں سکڑتی ہوئی ایک طرف خاموشی سے کھڑی
ہوگئی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوکر بولے ———— "تم بڑی خوبصورت ہو"

دنیا بھر کے پرندے درختوں پہ چہچہا رہے تھے۔ راستہ کے کناروں پر پھول کھلے
ہوئے تھے۔ آم کی شاخوں پہ بُور نکل آیا تھا۔ معلوم ہوا ساری کائنات درہم برہم ہوکر
پاگل ہوگئی ہے۔ میں کیسے گھر آئی۔ کوئی خبر نہیں۔ فوراً گیلے کپڑوں سے ہی گھر میں چلی
گئی۔ مالک کو نہ دیکھ سکی۔ صرف تالاب کے راستہ کا سایہ روشنی میں جذب ہو کر میری
آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔

اس دن گوروجی جب کھانا کھانے بیٹھے تو پوچھا "آنندی کہاں ہیں؟"
میرا شوہر میری تلاش کرتا رہا۔ مگر مجھے دیکھ نہ پایا۔

اب میرے لئے یہ کائنات نہیں۔ میں آفتاب مشرق کو دیکھ کر بھی اس سے دور
رہ گئی۔ گھر میں اپنے مالک کو پکارتی ہوں وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔

وہ دن کیسے گذرا یہ نہیں بتا سکتی۔ رات کو شوہر سے ملونگی۔ اسوقت خاموشی سے
باتیں کرونگی۔ ان کا جی باغ باغ ہو جائے گا۔ اس تاریکی میں یہ خیال کرتی کہ کیسے

سادہ انداز سے باتیں سمجھتے ہیں۔ گھر گرہستی کے کام میں مجھے قدرے دیر لگ جاتی تو وہ میرا انتظار کرتے۔ عام طور پر ہمارے لئے اُس وقت گوروجی کا ذکر ہی موضوع ہوا کرتا تھا۔

اُس دن کافی رات گزر گئی۔ آٹھ گھنٹے گذر گئے۔ گھر میں دیکھتی ہوں میرے بھگوان ابھی تک گھر نہیں آئے نیچے کی منزل میں سو گئے تھے۔ بڑی ہوشیاری سے خاموشی کے ساتھ میں اُن کے قدموں میں سو گئی۔ نیند میں اُنہوں نے ایک بار پاؤں پھیلایا وہ میری چھاتی پر آگیا۔ اسے میں نے اُن کا آخری عطیہ خیال کیا۔ دوسرے دن جب وہ بیدار ہوئے۔ تو میں اُٹھ بیٹھی تھی۔ کھڑکی کے باہر درخت پر ابھی تاریکی نظر آئی —— پرندے ابھی بولے نہیں تھے۔

میں نے سر جھکا کر شوہر کو پرنام کیا۔ وہ عجلت سے اُٹھے میرے مُنہ کیطرف دیکھ کر بھوت ہوگئے۔

میں نے کہا —— "میں اب دُنیا چھوڑنا چاہتی ہوں" —— معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے خواب سمجھا۔ اور خاموش ہی رہے۔

میں نے کہا —— "میرے سر کی قسم تم دوسرا بیاہ کر لو۔ میں وداع ہوتی ہوں —— شوہر نے کہا —— "تم یہ کیا کر رہی ہو۔ یہ تمہیں کس نے کہا" —— میں نے کہا —— "گوروجی نے" شوہر حیرت زدہ ہو کر بولے —— "گورو نے یہ کب کہا"۔ میں نے کہا —— "آج سویرے میں جب نہا کر آ رہی تھی تو ان سے ملاقات ہوئی اسوقت کہا تھا"۔ اس دفعہ شوہر کا گلا لرز اُٹھا بولے —— "یہ اُنہوں نے کیوں حکم دیا"۔ میں نے جواب دیا —— "میں نہیں جانتی ان سے دریافت کر کے بتانا ہوگا

تبادیں گے"۔ شوہر نے کہا ـــــ "دنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے روگردانی ہو سکتی ہے
ن یہ بات گورو کو سمجھا دونگا"۔ میں نے کہا ـــــ "شاید گورو سمجھ جائیں مگر میرا جی نہیں
جھے گا۔ میرا گرہستی کا کام آج سے تمام ہو گیا۔

شوہر خاموش رہا جب بادل چھٹ گئے تو بولے ـــــ "چلو تو ہم دونوں ایک
ر اکٹھے اُن کے پاس جائیں"۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا ـــــ "میں اب اُن کے
امنے نہیں ہو سکونگی"۔ اُنھوں نے میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیا اور خاموش رہے۔

میں جانتی ہوں انھوں نے ایک طرح سے میرے دل کا امتحان لے لیا۔

اس زمین پر دو آدمیوں نے مجھ سے زیادہ محبت کی تھی میرا لڑکا اور میرا شوہر
محبت ہی میری زندگی تھی۔ وہ جھوٹ برداشت نہ کر سکے گی۔ ایک مجھے چھوڑ کر چل دیا
ر دوسرے کو میں چھوڑ آئی۔ اب سچائی کی تلاش میں ہوں۔ دھوکہ نہیں کھاؤنگی یہ کہہ
ہ سربسجود ہو گئی

تریتیہ کالی

ٹوٹے پھوٹے گھاٹ کے پاس میری کشتی بندھی تھی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔
کشتی کی چھت پر ملاح نماز پڑھ رہا تھا۔ مغرب کی رعنائی شفق دھدکتے ہوئے
سرخ آسمان پر اُسکی خاموش کشش لمحہ بہ لمحہ تصویر سی نقش کرتی جا رہی تھی۔
ساکن بہتی ہوئی ندی کے پانی پر بے انداز چھوٹی چھوٹی لہریں بڑھتی ہوئی سنہرے
گہرے نقوش بنے سے متبدل ہوتی ہوئی تعجب افزا ہو رہی تھیں۔

اس خستہ حال بنگلے اور ٹھکتے ہوئے برآمدے والے پرانے مکان کے سامنے
میں برگد کی جڑ سے چھٹے ہوئے گھاٹ پر جھینگروں کی جھنکاریں شام کے وقت
بیٹھا ہوا تھا۔ میری خشک آنکھوں کی پلکیں تر ہونا ہی چاہتی تھیں کہ اتنے میں
سر سے پاؤں تک فی الوقت چونک کر میں نے سُنا ـــــ" آپ کہاں سے آ رہے ہیں"
دیکھا وہ نیک آدمی کم خوری سے دبلا پتلا اور قسمت کے ذریعہ از حد ملعون ہے
بنگال کے زیادہ تر بدیشتی نوکروں کی جیسی ایک قسم کی کافی عرصے سے مردنی سی شکل

ہوا کرتی ہے۔ اس کی بھی ویسی ہی تھی۔ دھوتی کے اُوپر ایک میلی انڈی کی اچکن — جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ — دفتر سے کام کر کے ابھی ابھی آ رہا ہے جس وقت اسے کچھ کھانا پینا چاہیئے تھا۔ اُس وقت بد قسمت دریا کے کنارے صرف شام کو ہوا خوری کے لئے آیا ہے۔

تو وہ اُدھیڑ عمر والا بینچ پر میرے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کہا — "میں رانچی سے آ رہا ہوں"۔

"کیا کام کرتے ہو"۔

"بیوپار کرتا ہوں"۔

"کونسا بیوپار کرتے ہو"۔

"ریشم اور لکڑی کا کام"۔

"کیا نام ہے؟"

تھوڑی دیر ٹھہر کر ایک نام بتا دیا۔ مگر وہ میرا نام نہیں تھا۔

اُس بھلے آدمی کا تجسّس ختم نہ ہوا۔ اُس نے پھر پوچھا — "یہاں کیسے آنا ہوا؟"

میں نے کہا — "ہوا بدلنے"

اُسے کچھ حیرت ہوئی کہنے لگا — "اجی صاحب میں لگ بھگ چھ سال سے یہاں کی ہوا اور اس کے ساتھ روزانہ پندرہ گرین کونین کھا رہا ہوں۔ مگر کچھ بھی فرق معلوم نہیں ہوا۔

میں نے کہا — "یہ تو ماننا ہی پڑیگا۔ کہ رانچی کی ہوا اور اس ہوا میں کافی فرق ہے"۔

انہوں نے کہا۔ "جی ہاں کافی ۔۔۔۔ یہاں کہاں ٹھہریں گے ؟"

میں نے گھاٹ کے سامنے والا پرانا کھنڈر یلا مکان دکھا کر کہا۔ "اس مکان میں" شائد اُسے کچھ شبہ ہوا۔ کہ مجھے اس گرے ہوئے مکان میں گڑے ہوئے کسی پوشیدہ خزانے کا پتہ لگ گیا ہے۔ مگر انہوں نے اس موضوع پر کوئی سوال نہ اٹھایا۔ صرف آج سے پندرہ سال پہلے اس خوفناک مکان میں جو حادثہ ہوا تھا۔ میں اسکی تفصیل سُننے لگ گیا۔

وہ یہاں کے سکول ماسٹر ہیں۔ اُن کے بھوک اور بیماری سے کمزور چہرہ پر گنجی چاند کے نیچے بڑی بڑی دو آنکھیں اپنے گڑھوں سے غیر فطری جلال برساتی ہوئی پُر نور ہو رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر انگریز شاعر مولرک کے پرانے ملاح کی یاد آگئی۔

ملاح نماز ختم کر کے رسوئی بنانے لگ گیا۔ شام کی آخری خوشنما تاریکی میں متبدل ہو گئی۔ اور گھاٹ کے سامنے والا سنسان مکان جن کی مانند ساکن کھڑا نظر آیا۔

سکول ماسٹر کہنے لگا ۔۔۔۔ میرے اس گاؤں میں آنے سے دس سال پہلے بھینی بھوشن یہاں رہا کرتے تھے۔ اُن کے تاؤ درگا موہن کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اُن کا بڑا بھاری کاروبار تھا۔ دولت اور جائیداد بھی کافی تھی۔ ان کی موت کے بعد اُن سب کا مالک ہوا بھینی بھوشن۔

مگر بھینی بھوشن میں ایک برائی تھی۔ اُن پر نئی روشنی کا بھوت سوار ہو گیا۔ پڑھے لکھے مہذب آدمی تھے۔ جوتے سمیت صاحب کے دفتر میں داخل ہو کر فی البدیہہ انگریزی بولتے تھے۔ اس پر رکھوالی داڑھی۔ اس سے انگریز سوداگروں کے ذریعے

اُن کی جو ترقی ہوئی وہ بھی رُک گئی۔ دیکھنے میں وہ عہد حاضرہ کے بنگالی معلوم ہوتے تھے۔
یہ تو تھا ہی۔ گھر میں ایک اور آفت آپڑی۔ ان کی دُلہن تھی۔ خوبصورت کالج کی تعلیم یافتہ اُس پر خوشنما رنگ رُوپ۔ بھلا پھر زمانہ قدیم کو کون پوچھے۔ ارے اور تو کیا ذرا سی طبیعت خراب ہوتے ہی اسسٹنٹ سرجن بلا لیا جاتا تھا۔ کھانا پینا اور پہننا بھی زمانہ کے ساتھ ساتھ متبدل ہوتا جاتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں آپ ضرور شادی شدہ ہونگے۔ اس لئے آپ سے تو یہ کہنا ہی فضول ہے کہ عام طور پہ عورتیں کچے آم۔ مریچ اور ترشی کو پسند کرتی ہیں۔ جو بدقسمت مرد اپنی عورت کی محبت سے محروم ہوتا ہے۔ وہ بدصُورت یا غریب۔ دراصل وہ از حد قابل غور اور ـــــ سادہ لوح ہوا کرتا ہے۔

اگر آپ دریافت کریں کہ کیوں ایسا ہوا تو اس موضوع پر بھی میں نے کافی غور کیا ہے جیسی جس کی عادت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر وہ سکھی نہیں رہتا۔ ہرن اپنے سینگوں کی مضبوطی سے جانکار ہونے کے لئے بڑے درخت کا تنا تلاش کرتا ہے۔ کہ دل سے سینگ گھس کر اُسے آرام نہیں ملتا۔ جب سے مرد اور عورت کا تفرق رُونما ہوا ہے۔ اُس وقت سے عورتیں بدفطرت مردوں کو مختلف ترکیبوں پھسلا کر اپنا گرویدہ بنانے کے لئے مستعد رہا کرتی ہیں مگر جو مرد اپنے آپ ہی قابو میں آجاتے ہیں۔ اُن کی عورتیں بالکل بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں جو اپنی آنکھ کی چتونوں میں دریدہ ہزاروں جھنکار وغیرہ کی عادتیں ملی ہیں۔ وہ بھی سب فضول اور بیکار ہو جاتی ہیں۔

عورت چاہتی ہے کہ مرد کو پھسلا کر اپنی طاقت سے محبت کو پاتے ـــــــ شوہر اگر بھلا آدمی بن کر اتنا بھی اسے موقع نہ دے تو سمجھنا چاہیئے کہ اُسکی تقدیر

ہی ہموُٹی ہے۔ اور عورت کی تو اس سے بھی بڑھ کر۔

نئی تہذیب کی تعلیم کے منتر سے مرد نے اپنی عادت سے قدرت کی دی ہوئی وحشت و بربریت کھو کر عہدہ حاضرہ کے ازدواجی تعلق کو کمزور کر ڈالا ہے۔ بدقسمت بھینی بھوشن عہدہ حاضرہ کی مشین سے کافی بھلا آدمی بن کر نکلا تھا ـــــــــــ نہ تو بیوپار میں زیادہ کچھ کر سکا۔ اور نہ ہی گھریلو زندگی میں اتنا سکھی ہوا۔

بھینی بھوشن کی عورت منی مالکہ کو بلا وجہ محبت سے بغیر آنسو بہائے ڈھاکہ کی ساڑھی اور بازوبند مل جایا کرتے تھے۔ اس طرح اس کی نسوانیت کا انداز اور محبت کا اظہار بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ وہ صرف لیتی ہی تھی۔ دیتی کچھ نہ تھی۔ اسکا سادہ لوح اور ناواقف ہوا می سمجھتا تھا۔ کہ دان ہی شاید روزانہ کا شغل ہے۔ بالکل الٹا سمجھ رکھا تھا بیچارے نے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شوہر کو وہ اپنے لئے ڈھاکہ کی ساڑھی اور بازوبند کی مشین ہی سمجھتی تھی ـــ مشین بھی ایسی اچھی کہ کبھی کسی دن اس میں ایک بوند تیل دینے کی ضرورت تک نہیں پڑتی۔

بھینی بھوشن کا وطن تھا پھول بیڑے اور بیوپار کا کام تھا۔ کام کاج کے لئے عام طور پر اُسے یہاں ہی رہنا پڑتا تھا۔ پھول بیڑے میں اسکی ماں نہیں تھی۔ پھر بھی بوآ موسی وغیرہ عورتیں تھیں۔ بھینی بھوشن بوآ اور موسی وغیرہ کی بھلائی کے لئے ہی خوبصورت دلہن کو بیاہ کر گھر لایا۔ ایسا نہیں۔ اس لئے اُس نے بہو کو ان پانچ عورتوں سے لا کر ایک کوٹھی میں اکیلے ہی لا کر رکھا تھا۔ مگر باقی حقوق کے استحقاق میں یہ راز ہے۔ کہ بہو کو پانچ عورتوں سے الگ کر کے

ہا اپنے پاس رکھنے سے اُس کے جی پر زیادہ اثر پڑیگا۔ ایسا نہیں تھا۔
اس کی بہو زیادہ بولتی نہیں تھی۔ ہمسایہ عورتوں کے ساتھ بھی وہ کم میل ملاپ
ہتی تھی۔ برت پُوجا وغیرہ کے موقعوں پر براہمن کو کھلانا یا وشنو بھکاری کو
و پیسے دینا یہ اُس سے کبھی نہیں ہوا۔ اُس کے ہاتھوں سے کوئی شے کبھی
ائع نہیں ہوئی تھی۔ صرف شوہر کی محبت کو چھوڑ کر اور جو کچھ اُسے ملا تھا اسکو
، احتیاط سے رکھتی گئی۔ حیرت تو یہ ہے کہ جیسے اُس نے اپنے کمال شباب سے
معہ پھر بھی ضائع نہیں کیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چوبیس سال کی عمر میں بھی وہ چودہ
ل کی مانند ناپختہ اور ملائم دکھائی دیتی تھی۔ جنکا دل برف کا تودا ہوتا ہے۔ جن کے
ں میں پریم کی جلن اور تڑپ کے لیئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ شاید کافی دنوں تک تازہ
م رہتے ہیں۔ وہ کنجوس اور ممسک کی مانند اندر اور باہر سے اپنے آپ کو سنبھال
نبھال کر رکھتے ہیں۔

نہایت خوشنما بیل کی مانند قدرت نے منی مالکا کو بے ثمر اور ناپستہ رکھا۔
سے اولاد سے بہرہ یاب نہ کیا۔ یعنی اُسے ایسی کوئی چیز نہ دی جسے وہ اپنے
پنی صندوق کے زیورات اور جواہرات سے بھی بیش قیمت خیال کرتی۔ جو موسم
ر کے تازہ آفتاب کی مانند اپنی نرم و نازک شعاعوں سے اُس کے جگر کو پگھلا کر
ر کر ہستی پر ایک محبت کی دھارا بہادیتی۔

منی مالکا کام کاج میں تندہی سے مصروف رہتی تھی۔ اُس نے کبھی بھی زیادہ
ر چاکر نہیں رکھے۔ جس کام کو وہ خود کرسکتی تھی۔ اُس کے لیئے کوئی دوسرا
تراہ لے جاسکے۔ یہ وہ برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ کسی کے لیئے سوچا نہیں

کرتی تھی۔ نہ کسی سے پریم کرتی تھی۔ صرف کام کرتی تھی۔ اور چیزیں قرینہ سے رکھا کرتی تھی۔ اس لئے اُسے بیماری۔ غم اور بخار نہیں آتا تھا۔ بے پناہ تندرستی بے انداز سکون اور یکجائی ہوئی گرہستی میں وہ ثابت قدم رہا کرتی تھی۔

زیادہ تر شوہروں کے لئے یہی کافی ہوا کرتا ہے۔ کافی کیا جسم میں کمر نام کی ایک چیز ہے۔ کمر میں درد ہوئے بغیر اسکی یاد نہیں آتی ——— گھر کی محافظ عورت نام کی جو ایک شے ہے۔ پریم کی مار سے قدم قدم پر اور چوبیسوں گھنٹے اس کے احساس کا نام۔ مگر گرہستی کی کمر میں درد ہے؟ کافی حد تک شوہر پرست عورت کے لئے عظمت کا موضوع بن سکتا ہے۔ مگر شوہر کے لئے وہ آرام کی چیز نہیں ہے ——— میری تو یہی رائے ہے۔

بھلا آپ ہی بتائیے۔ استری کو پورا پورا کتنا پریم ملا۔ اور کتنا کم ہوا۔ کافی باریکی سے دن رات اُس کو ترازوں پر تولنا کیا مردوں کا کام ہے۔ عورت اپنا کام کرے۔ ہم اپنا کام کریں ——— گھر گرہستی کا معمولی حساب تو یہی ہے۔ ان خیالات میں کتنا راز ہے کھلی بات میں کتنا بڑا استعارہ ہے۔ جمود لا تجزئے میں کتنی وسعت ہے ——— پریم کے متعلق اس قدر لطیف حقیقت قدرت نے مرد کو نہیں دی۔ اور نہ دینے کی کبھی ضرورت پڑی ہے۔ ہاں مردوں کی ذرا سی محبت اور نفرت کو لیکر عورتیں ضرور اسے تولتی ہیں۔ بات کی تہہ کو اور راز سے حقیقت کو وہ کھود کھود اور کرید کرید کر نکالا کرتی ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ مرد کا پریم ہی عورتوں کی طاقت ہے ——— اُن کی زندگی کے کاروبار کا اثاثہ ہے۔ اس کی ہوا دیکھ کر وہ ٹھیک وقت پر ٹھیک طرح سے

پھرتا رہتا ہے۔ تو ان کی گھروالی کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اس لئے قدرت نے پریم کے
وزن کا ترازو عورتوں کے خانہ دل میں لگا دیا ہے۔ مردوں کو بالکل نہیں دیا۔

مگر اب تو قدرت نے جو شئے نہیں دی۔ آج کل مردوں نے اُسے بھی حاصل کر
لیا ہے۔ شاعروں نے قدرت کو انگلی پر نچا کر یہ نایاب مشین ——— یہ تعجب افروز
کارخانہ ——— بلا غور و فکر ہر کہ ومہ کے ہاتھوں میں دیدیا ہے میں قدرت کو الزام
نہیں دیتا۔ اُس نے عورتوں کو کافی مختلف صورت میں تیار کیا ہے۔ مگر تہذیب کے
بل پر اب وہ تفرق بھی نہیں رہتا۔ اب عورتیں بھی مرد بن رہی ہیں۔ اور مرد عورتیں
بن رہے ہیں۔ اس لئے گھر سے سکون کا سلسلہ تو اب جاتا ہی رہا۔ اب تو شبھ
بیاہ سے پہلے آدمی کو بیاہا جا رہا ہے۔ یا عورت کا اُس بات کے کسی طرح فیصلہ
نہ ہونے پر دُلہا اور دُلہن دونوں کا دل شبہات سے اُلجھا رہتا ہے۔

آپ خوش معلوم نہیں ہوتے ——— اکیلا پڑا رہتا ہوں۔ عورت کے ذریعہ
بدر کیا ہوا ہوں۔ میں دُور سے گھر گرہستی کے بیشمار درپہ وہ راز دل میں کھولتا
رہتا ہوں ——— طالب علموں کے سامنے کہنے کے لائق موضوع نہیں ہے۔
اسی لئے موقعہ پاکر آپ سے کہتا ہوں۔ ذرا غور کر کے دیکھ لینا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اگرچہ رسوئی میں نمک کم نہیں ہوتا تھا۔ روزانہ
پان میں چونا زیادہ ہوا کرتا تھا۔ پھر بھی پھنی بھوشن کا دل نامعلوم کیسے تعجب خیز
بغاوت کا احساس کرتا رہتا تھا۔ عورت کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کوئی غلطی نہیں
تھی۔ مگر پھر بھی اس کی طرف سے شوہر کو کوئی سُکھ نہیں تھا۔ وہ اپنی رفیقۂ حیات
کے پژمردہ دل کی طرف بار بار اشارہ کر کے ہیرے۔ سینے۔ موتی اور جواہرات

نگے زیورات لایا کرتا تھا۔ مگر وہ بے معنی ہونے کی وجہ سے جا کر پڑتے تھے۔ آہنی صندوق میں۔ دل پژمردہ ہی بنا رہا ——— چچا درگا موہن تو پریم کو باریک بینی سے سمجھتے تھے۔ نہ اتنا تیزی سے اور اتنا زیادہ، مگر چچی اُسے اچھی طرح دیکھتی رہی۔ جیسے کاروباری بننا ہے۔ نئی روشنی کا بابو بننے سے اس کا کام نہیں چل سکتا تھا۔ جیسے شوہر بننا ہے۔ اُن کے لئے مرد بننا ضروری ہے ——— اس میں آپ ذرا بھی شک نہ کریں۔

ٹھیک اسی وقت سامنے کے جنگلے میں بڑی بلند آواز سے سیال بول اُٹھا۔ ماسٹر صاحب کی کہانی میں چند منٹوں کے لئے روکاوٹ پڑ گئی۔ اور یہ معلوم ہونے لگا۔ کہ اس تاریک تر مجلس میں چلبلی زینت افروز سکول ماسٹر کی کہی ہوئی ازدواجی سیاست سن کر یانئی تہذیب کے ہاتھوں شکست یاب بھنی بھوشن کے اخلاق پر رہ کر مخول ہونے لگا۔ اُس کے تخیلات میں پانی اور خشکی میں پہلے سے بھی زیادہ سکون آگیا۔ پھر ماسٹر صاحب نے شام کی تاریکی میں اپنی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں کو پھیر پھیر کر کہانی کہنا شروع کیا۔

بھنی بھوشن کے اُلجھے ہوئے وسیع بیوپار میں اچانک ایک گنجلک آ کھڑی ہوئی۔ کیا بات تھا۔ وہ میرے جیسے کاروباری کے لئے سمجھنا اور سمجھانا مشکل ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ اچانک نہ معلوم کیوں بازار میں اپنا کریڈٹ قائم رکھنا اُس کے لئے دشوار ہو گیا۔ اگر اُسے پانچ روز کے لئے کہیں سے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ مل جاتا۔ اور بازار میں بجلی کے روشن قمقموں کی مانند وہ روپیہ کی شکل دکھا دیتا۔ تو بس اتنے سے ہی ساری مشکلات دور ہو جاتیں۔ اور بیوپار کی کشتی خوب

تیزی سے دوڑنے لگی۔

روپیوں کا کچھ انتظام نہیں ہو رہا تھا۔ گاؤں اور آس پاس کے واقفکار مہاجنوں سے قرض لیا جا رہا تھا —— یہ افواہ پھیل جانے پر بیوپار کا دوگنا نقصان ہو گیا اس شبہ سے اُسے ناواقف جگہ سے قرض لینے کے لئے کوشش کرنی پڑی۔ مگر وہاں بلا زیور یا جائداد کے روپے کیسے مل سکتے تھے۔

زیور رکھنے پہ تحریر وغیرہ کا کوئی جھنجھٹ نہیں اور نہ دیری کا خوف ہے فوراً آسانی سے کام ہو جاتا ہے۔

بھینی بھوشن ایک بار اپنی عورت کے پاس گیا۔ اپنی عورت کے پاس مرد جسطرح بے خوف و خطر جا سکتا ہے بھینی بھوشن میں اس طرح جانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بدقسمتی سے وہ اپنی عورت کو کافی چاہتا تھا —— پریم کرتا تھا۔ جس طرح کا پریم کہانی کا ہیرو ہیروان سے کرتا ہے۔ جس پریم میں سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں۔ اور سب باتیں منہ کھول کر کہتے نہیں بنتی۔ جس پریم کی بے پناہ کشش زمین اور آفتاب کی کشش کی مانند درمیان میں کافی فاصلہ رکھتی ہے۔

پھر بھی ٹیڑھا سیدھا کوئی معاملہ آ پڑتا ہے۔ تو ہیرو کو بھی ہیروان کے پاس جا کر ہنڈی تمسک اور پرونوٹ کا سلسلہ جاری نہیں کرنا پڑتا۔ مگر زبان رُک جاتی ہے۔ اور فقرہ نامکمل ہو جاتا ہے۔ ایسی کام کی باتوں میں بھی جذبات کی کرختگی اور جگر میں غیرت کا لرزہ آ جاتا ہے۔ بدقسمت بھینی بھوشن صاحب طور پہ کہہ ہی نہیں سکا کہ سنتی ہو مجھے ضرورت آ پڑی ہے اپنے زیورات دیدو۔ بات تو بھی کہی مگر نہائیت کمزور لہجہ سے۔ منی مالکا نے جب منہ بنا کر اقرار نہ کیا تو اُسے کافی گہری چوٹ لگی۔

مگر اس نے زبان سے اُف تک نہ کی۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مردوں کی سی وحشت اس میں نام کو بھی نہیں تھی۔ جہاں اُسے زیور زبردستی چھین لینے چاہیئے تھے۔ وہاں وہ دلی چوٹ تک کو پی گیا۔ یہاں پریم کا ہی واحد استحقاق ہے۔ ستیاناس ہو جانے اور بالکل برباد ہو جانے پر بھی اس خیال کو دخل انداز نہ ہونے دیا ـــــ یہ اس کے دل کی رفتار تھی۔ اس معاملہ پر اسے اگر پھٹکارا جاتا تو شاید وہ ایسی لطیف دلیل پیش کرتا۔ کہ بازار میں میرا کریڈٹ کم ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں بازار کو لوٹ لوں۔ اور اگر عورت مجھ پر اعتماد کر کے زیور نہیں دینا چاہتی تب مجھے کوئی حق نہیں کہ میں اس کا زیور زبردستی چھین لوں۔ بازار میں جیسا رسوخ ہے۔ گھر میں اسی قسم کا پریم ہے۔ زور بازو تو صرف میدان کارزار میں ہی دکھانا چاہیئے۔ قدم قدم پر ایسی لطیف رکاوٹوں کو توڑنے کے لئے ہی کیا۔ قسمت نے مردوں کو اتنا فراخدل ایسا زور آور اور باہمت بنایا ہے؟ کیا اُسے بیٹھے بٹھائے نہایت آرام سے دلی احساسات کو تیزی سے محسوس کرنے کی فرصت ہے؟

کچھ بھی ہو اپنے متمدن جذبات کے نشہ میں عورت کے زیورات کو نہ چھو کر وہ دوسری ترکیب سے روپوں کا انتظام کرنے کے لئے کلکتہ چلدیا۔

دنیا میں عام طور پر عورت کو شوہر جتنا پہچانتا ہے۔ شوہر کو اس سے کہیں زیادہ عورت پہچانتی ہے۔ اور اگر شوہر کی فطرت از حد لطیف ہو تو عورت کے دام محبت میں وہ مکمل کھلا نظر نہیں آتی۔ بھبھی بھوشن کی عورت پورے طور پر یہ باتیں نہیں سمجھتی تھی۔ عورتوں کی زمانہ قدیم سے جو چلبلاہٹ چلی آئی ہے۔ عہد حاضرہ کے مرد اس کی حدود سے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہ کچھ اور ہی طرح کے ہیں جو عورتوں

کی طرح راز دار ہوتے جا رہے ہیں - عام لوگوں کے جو کئی ایک گروہ ہیں ——— یعنی کسی کی فطرت میں وحشت. کسی میں بھونڈا پن اور کوئی بالکل ہی آنکھیں موندے رہتا ہے ——— ان میں سے کسی ایک سے اس کی تطبیق نہیں کی جا سکتی۔

منی مالکہ نے مشورہ کے لئے اپنے مشیر کو بلایا گاؤں کے رشتہ یا دور کے ناطہ میں منی مالکہ کا ایک بھائی بھینی بھوشن کے گماشتہ کے نیچے کام کرتا تھا - اس کی ایسی عادت نہیں تھی. کہ کام دکھا کر اپنی ترقی کرانے کی کوشش کرے بلکہ موقعہ پاتے ہی رشتہ داری کے بل پر وہ تنخواہ یا اس سے زیادہ کچھ نہ کچھ وصول کر لیا کرتا تھا۔

منی مالکہ نے اُسے بلا کر سب باتیں کہہ کر پوچھا ——— اب کیا مشورہ دیتے ہو

اس نے فراست داں کی مانند سر ہلایا ——— یعنی آثار تو اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ عقلمند لوگ کبھی بھی آثار بہتر نہیں پاتے۔ بولا ——— بابو جی کہیں سے روپے لا ہی نہیں سکتے. تمہارے زیور لٹ کا نمبر آئیگا۔

منی مالکہ نے شوہر کو جہاں تک پہچانا تھا۔ اس نے یہ سمجھا کہ ممکن ہے یہ درست ہے۔ اُس کا فکر و افزتر ہونے لگا۔ اس گھر میں اس کا کون ہے؟ اولاد اُس کے نہیں۔ شوہر ہی تو ہیں لیکن اُن کے دل میں میرا احساس تک نہیں؟ ——— اُن کی جو واحد تر محبت کی شئے ہے۔ اُن کی اولاد کیطرح ہر سال بڑھتے جا رہی ہے سونے کی شکل میں ہے۔ جواہرات وغیرہ کے گلے کے سر کے ہاتھوں کے اور پیشانی کے زیور ہیں ——— کافی دیر کی محفوظ رکھی ہوئی۔ یہ تمام چیزیں لمحہ بھر میں خسارہ کے بے پناہ سمندر میں پھینک دی جائیں گی۔ یہ خیال کرتے ہی اُس کا سارا جسم برف کی مانند ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس نے کہا ——— اب کیا کیا جائے؟

مدھوسودن نے کہا ـــــ "زیور لیکر فوراً ہی میکے چلی جاؤ۔"

زیورات کا کچھ حصہ یا زیادہ تر کس قدر اس کے حصہ میں آئیگا۔ دل ہی دل میں مدھوسودن نے اس کی ترکیب سوچ لی۔

منی مالکہ اس معاملہ پر فی الفور راضی برضا ہو گئی۔

ہارڈ کے آخیر میں شام کو اسی گھاٹ پر ایک کشتی آکر لگی۔ رات کے تاریک تر بادلوں میں خواب سے عاری خائف موٹی چادر میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی منی مالکہ کشتی پر جاکر بیٹھی۔ مدھوسودن کشتی سے بیدار ہو کر بولا ـــــ "زیورات کا بکس مجھے دیدو۔"

منی نے کہا ـــــ "یہ بعد کو ہوگا۔ پہلے کشتی کھول دو۔"

کشتی کھول دی۔ تیز دھار کو چیرتی ہوئی کشتی بہہ نکلی۔

منی مالکہ ساری رات بیٹھی بیٹھی ایک ایک کرکے اپنے سارے زیور پہنتی رہی ـــــ سر سے لیکر پاؤں تک کہیں بھی تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بکس میں زیور رکھنے سے بکس ادھر اُدھر ہو سکتا تھا۔ یہ خوف اس کے دل میں پہلے ہی مسلط تھا۔ مگر جسم پر پہن لینے سے اُس کی جان کا خون کئے بغیر کوئی اس سے زیور لے نہیں سکتا۔

اس کے ساتھ کوئی پیٹی یا صندوق نہ دیکھ کر مدھوسودن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ ـــــ موٹی چادر میں منی مالکہ اپنی جان سے زیادہ بوجھل زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ مگر اُس کے خیال میں کچھ نہ آیا۔ منی مالکہ پھنی بھوشن کو بے شک نہیں پہچانتی۔ مگر مدھوسودن کے پہچاننے میں کوئی کسر نہیں تھی۔

مدھوسودن گماشتے کو ایک چٹھی لکھ کر دے گیا تھا۔ کہ وہ مالکن کو میکے پہنچانے

جا رہا ہے۔ گماشتہ بھینی بھوشن کے والد سے چلا آرہا تھا۔ اُسے بڑا غصہ آیا۔ اس نے پورے جوش اور غضب سے مالک کو ایک چٹھی لکھی ——— زبان اچھی نہیں تھی۔ مگر عورت کو سر چڑھانا مرد کی شان کے شایاں نہیں۔ یہ امر اچھی طرح سے واضح کر دیا۔

بھینی بھوشن منی مالکہ کے دل کے راز کو بھانپ گیا۔ اُس کے دل پر سب سے گہری یہ چوٹ لگی۔ کہ میں نے کافی خسارہ کے باوجود عورت کے زیوروں پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ روپؤں کے لئے دربدر بھٹک رہا ہوں۔ پھر بھی مجھ پر شُبہ ہے کہ وہ مجھے پہچان نہیں پائی۔

اپنے متعلق جس سخت نا انصافی سے بھینی بھوشن کو غصہ کرنا چاہئے تھا۔ اُس سے وہ مغموم ہوکر رہ گیا۔ آدمی کو قدرت کی طرف سے سزا مل چکی ہے اسی لئے انہیں اس نے تیز تر طیش پنہاں رکھا ہے۔ اپنے یا دوسروں کے لئے نا انصافی کی کشمکش ہوتے ہی اگر وہ بھک سے جل نہ جائے تو دھکار ہے مرد کو۔ مرد کو ذرا سی بات ملنے پر فوراً دھدھک اُٹھنا چاہیئے۔ اور عورتوں کو ساون کے بادل کی مانند بلا وجہ آنسو بہاتے رہنا چاہئے ——— قدرت نے ایسا ہی انتظام کیا تھا۔ مگر اب اس کی چلتی کہاں تھی۔

بھینی بھوشن نے مجرم عورت کے لئے دل ہی دل میں کہا .... اگر تم یہی چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔ میں اپنا فرض بجا لاؤنگا ——— اور بھی چار پانچ صدی بعد دُنیا جب روحانی قوت سے محو گردش ہو گی۔ تو جس کو پیدا ہونا چاہئے۔ وہ مستقبل کا بھینی بھوشن اُنیسویں صدی میں مخط افروز ہو کر زمانہ قدیم کی عورت سے بیاہ کر بیٹھا ہے۔ شاستروں میں جس کی عقل کو قیامت خیز کہا گیا ہے۔

بھینی بھوشن نے بھی عورت کو ایک حرف تک نہ لکھا۔ دل میں مصمم ارادہ کر لئے

لگا۔ کہ اس موضوع پر منی سے کبھی کوئی بات دریافت نہیں کرونگا۔کتنی سخت سزا ہے۔

آٹھ دس دن کے بعد کسی طرح روپوں کا انتظام کر کے مصیبت زدہ بھینی بھوشن گھر واپس آیا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ میکے میں زیور وغیرہ رکھ کر منی اب تک واپس آگئی ہوگی۔ اُس دن کی لجاجت کو چھوڑ کر جب عورت سے ملونگا تو منی شرمسار ہوگی اور اپنی غیر ضروری کوشش کے لئے کف افسوس ملیگی ــــــ اس بات کا خیال کرتے کرتے بھینی بھوشن حرم سرا میں خوابگاہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

دیکھا دروازہ بند ہے۔ تالا توڑ کر اندر جا کر دیکھا تو گھر سونا ہے۔ ایک سمت آہنی صندوق کھلا پڑا ہے۔ اس میں زیورات کا نام و نشان تک نہیں۔ سوامی کے جگر میں تیر لگ گیا ــــــ معلوم ہوا کہ دنیا بے مطلب و مقصد ہے۔ پریم اور کاروبار سب فضول ہے۔ ہم اس دنیا داری کے پنجرہ کی ہر ایک سلاخ پر دم توڑنے بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں چڑیا ہے ہی نہیں۔ اور رکھنے سے بھی نہیں رہتی ــــــ پھر کیوں دن رات دل کو خونیں کر کے آنسوؤں کی زنجیر میں پروتا ہوں۔ دیر کے اس محبت افروز دیران دینوی پنجرہ کو بھینی بھوشن نے دل ہی دل سے ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا۔

بھینی بھوشن نے اپنی عورت کی تلاش کے لئے کوئی کوشش کی سوچا اگر اسکی مرضی ہوگی تو آجائیگی۔ بوڑھے برہمن گماشتے نے آکر کہا ــــــ خاموش ہو کر بیٹھنے سے کیا فائدہ ــــــ بہو کی خبر تو لینی چاہیئے۔ یہ کہہ کر اُس نے بہو کے میکے آدمی بھیجدیا۔ وہاں سے خبر آئی۔ کہ منی یا مدھو ان ہر دو میں سے کوئی بھی یہاں نہیں پہنچا۔

چاروں طرف شور مچ گیا۔ دریا کے کنارے کنارے دریافت کرتے ہوئے آدمی دوڑے۔ مدھو کی تلاش کے لئے تھانہ میں خبر دی گئی ـــــ کس کشتی پہ۔ کون ملاح تھا کس راستہ سے کہاں گئے۔ کچھ بھی پتہ نہ چلا۔

ہر طرح سے مایوس ہو کر ایک دن شام کے وقت اُس نے اپنی سُونی خوابگاہ میں قدم رکھا۔ اُس دن جنم اشٹمی تھی۔ صُبح سے مُوسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ گاؤں کے باہر ایک جگہ جنم اشٹمی کا میلہ لگتا ہے۔ وہاں بڑے بھاری شامیانے کے نیچے ناٹک ہو رہا تھا۔ موسلا دھار بارش کی آواز بھی آنے لگی۔ یہ سامنے جو کھڑکی کی دکھائی دے رہی ہے۔ جس کے قلابے ڈھیلے ہو گئے تھے۔ پھنی بھوشن اس کھڑکی کے پاس اندھیرے میں اکیلا بیٹھا تھا ـــــ برساتی ہوا۔ دھیمی بوچھاڑ اور گانے کی گھر میں آواز آرہی تھی ـــــ مگر اُسے کوئی خبر نہیں تھی۔ گھر کی دیوار پہ آرٹ سٹوڈیو کی لکشمی سرسوتی کی تصویروں کی ایک جوڑی آویزاں تھی۔ کھونٹی پہ انگوچھا اور تولیہ ایک جوڑے کنارے کی ساڑھی اور ایک ڈوریا کی ساڑھی حال ہی کی استعمال میں آنے کے لئے بڑی ترتیب سے چُنی ہوئی لٹک رہی تھی۔ ایک کونے میں تپائی پہ پیتل کے پان دان میں منی مالکہ کے اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پان خشک ہو گئے تھے۔ شیشے کی الماری میں اس کے چینی مٹی کے کھلونے۔ ایسنس کی شیشیاں۔ رنگین کانچ کی ڈکنسٹر۔ بڑھیا تاش اور سمندر کی کوڑیاں اور توکیا صابن کا بکس تک قرینہ سے رکھا ہوا تھا۔ اپنے جس چھوٹے سے بڑھیا لیمپ کو وہ شوق سے روزانہ جلا کر رکھا کرتی تھی۔ وہ ویسے کا ویسا ہی بجھا ہوا پڑا ہے۔ صرف یہ چھوٹا سا لیمپ ہی اس خوابگاہ میں منی مالکہ کے آخری لمحات کی شہادت ہے جو ہر ایک شئے

کو بے رونق کر کے چلا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے نشان اور اپنی تاریخ ہر ایک بیغرودی روح شے اپنے نرم دل کی محبت سے منقش کرتا جاتا ہے۔

آؤ میری مالکہ آؤ۔ تم اپنا چراغ خود آکر جلاؤ۔ تم اپنے مکان میں خود آکر روشنی کرو۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر بڑے چاؤ سے اپنی چنی ہوئی ساڑھی آکر پہنو۔ تمہاری چیزیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ کوئی تم سے کچھ چاہے گا نہیں۔ کوئی کچھ مانگے گا نہیں۔ صرف تم یہاں آکر بس ایک بار اپنی صورت دکھا کر۔ اپنے بے پناہ شباب اور اپنی دلکش خوشنمائی سے چاروں طرف بکھری ہوئی ان بے رونق چیزوں کو رونق بخشو۔ ان تمام بے زبان اشیا کو اپنے سحر سے کیوں بے کیف بنا گئی ہو۔

رات کی تاریکی میں کب بارش رکی اور کب ناٹک کا گانا بند ہوا۔ پتہ نہیں۔ پھنی بھوشن جس طرح جنگلے کے پاس بیٹھا تھا۔ اسی طرح بیٹھا رہا۔ کھڑکی کے سامنے خوفناک تاریکی ہے۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ کہ سامنے موت کا باب منہ پھاڑے کھڑا ہے — جیسے یہاں رونے سے عرصہ بعید کی گم شدہ شے فی الفور نظر آجائے تو ممکن ہے۔ اس تاریکی سے سیاہ موت کے پردہ پر یا اس غائیت درجہ تاریک کسوٹی پر گم شدہ سونے کی چمک نظر آجائے یہ ممکنات سے بعید نہیں تھا۔

اتنے میں ایک آہٹ کے ساتھ زیور کے چھم چھم کی آواز سنائی دی اور یہ معلوم ہوا۔ جیسے آواز دریا کے گھاٹ سے مکان کی طرف آرہی ہے۔ اس وقت دریا کا پانی اور تاریکی دونوں مدغم تھے۔ مبہوت پھنی بھوشن اپنی منتظر آنکھوں کو پھاڑ کر تاریکی کو دھکیل دھکیل کر پھوڑ پھوڑ کر دیکھنے کی کوشش میں محو تھا —

خوشی میں پھولا نہ سمایا۔ اس کا دل اور آنکھیں متزلزل ہو اٹھیں۔ مگر کچھ دکھائی

دیا۔ دیکھنے کی کوشش دم بدم بڑھنے لگی۔ تاریکی اور بھی غالب آنی گئی ——
نیا سا نظر آتی تھی۔ قدرت نے اس خاموش رات میں موت کے خوفناک دروازہ
۔ اچانک مہمان کی آمد دیکھ کر جلد ہی ہاتھ بڑھا کر جیسے اور بھی پردہ ڈالدیا۔

آواز متواتر گھاٹ کے کنارے سے بڑھتی ہوئی مکان کی طرف سے آنے
تی۔ اور مکان کے سامنے آکر رک گئی۔ ڈیوڑھی بند کر کے دربان ناٹک دیکھنے
یا تھا۔ ایسے معلوم ہوا۔ کوئی دروازہ کو کھٹکھٹا رہا ہے۔ یعنی تاریکی کے ساتھ ساتھ
سخت شے دروازہ پر آکر ٹکرائی ہے۔ اب پھینی بھوشن سے رہا نہ گیا۔ گل شدہ
اغ والے تاریک تر کمرے کو پار کر کے اندھیری سیڑھیوں سے اُتر کر وہ بند
وازہ کے پاس پہنچا۔ دیکھا تو تالا بند تھا۔ پھینی بھوشن دونوں ہاتھوں سے انکو
جھوڑنے لگا۔ اُسے معلوم ہوا کہ وہ عالم خواب میں ہی اُٹھ آیا ہے۔ اُس کا
را جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ہاتھ پاؤں برف کی مانند خنک اور دل بجھتے ہوئے
اغ کی مانند لرز رہا تھا۔ جب خواب ختم ہو گیا تو دیکھا باہر کسی قسم کی آواز نہیں ہے
رف ساون کی بوندا باندی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور اسی کے ساتھ
نک میں گائے جانے والے گیت کی آواز آرہی تھی۔

اگرچہ یہ خواب ہی تھا۔ اتنا حقیقت افروز جس سے پھینی بھوشن کو معلوم
ا۔ کہ نہایت قلیل عرصہ میں وہ اپنی اُمیدوں اور آرزوؤں کو ختم کر کے محروم
گیا ہے۔ بارش کی آواز کیساتھ دُور سے سُنائی دینے والی بھیرویں کی تان
ن کو کہنے لگی —— یہ بیداری ہی خواب ہے۔ اور یہ دُنیا محض فریب ہے۔
اس کے دوسرے دن بھی ناٹک تھا۔ اور دربان کے لئے چھٹی تھی پھینی بھوشن

نے حکم دیا۔ کہ آج ساری رات ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رہیگا۔ دربان اینے کہا۔ جشن میں کئی جگہ کے مختلف آدمی آتے ہیں ــــــ دروازہ کھلا رکھنا بہتر نہیں ہے
بھینی بھوشن نے بالکل نہ مانا۔ دربان نے کہا ــــــ "تو پھر میں ساری رات یہاں ہی رہ کر پہرہ دونگا"
بھینی بھوشن نے کہا ــــــ "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تمہیں ناٹک دیکھنے کے لئے ضرور جانا ہوگا"
دربان بڑی حیرت میں پڑ گیا ــــــ "انہیں ہو کیا گیا ہے"
دوسرے دن شام سے ہی چراغ گل کر کے بھینی بھوشن اپنی خوابگاہ میں اسی جنگلے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ آسمان پر پانی سے لبریز بادل اُمڈ رہے تھے۔ اور چاروں طرف عجیب انداز کی گہری خاموشی تھی۔ مینڈکوں کی غیر مختتم راگنی اور ناٹک کے گانے کی آواز بھی اس سناٹے کو توڑ نہیں سکتی تھی۔ بلکہ وہ انہیں ایک غیر موزوں لذت کی چاشنی ڈال رہی تھی۔
کافی رات گئے۔ جب مینڈکوں۔ ناٹک والوں اور جھینگروں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اور رات کی تاریکی پر نامعلوم ایک اور پردہ پڑا۔ ہاں اب وقت ہو گیا کل کی مانند دریا کے کنارے گھاٹ پر پھر وہی آواز اور جھم جھم سنائی دی۔ مگر بھینی بھوشن نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اسے خوف طاری ہوا کہ کہیں لاچارگی سے تمام خواہشات مٹی میں نہ مل جائیں۔ کہیں تکرار کا زور اُس کے احساسات کو مرغوب نہ کر ڈالے۔ اس نے قوت بھر کوشش کر کے اپنے آپ پر قابو پانے کی جبارانہ کی۔ اور پتھر کی تصویر کی مانند سخت ہو کر بیٹھ گیا۔

آواز نے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دروازہ میں داخل ہونا شروع کیا سُنائی دیا
اندر محل کی گول سیڑھیوں سے چکر لگاتی ہوئی آواز اوپر آرہی ہے پھنی بھوشن
نے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ اُس کا دل طوفان کا شکار ہو جانے والی کشتی کی مانند
ڈگمگانے لگا۔ اور سانس رُک جانے کی نوبت آگئی۔ گول سیڑھیوں کو پار کرکے
آواز برآمدہ سے ہوکر متواتر کمرہ کے قریب تر ہوگئی۔ آخر کار بالکل خوابگاہ
دروازہ پر آکر رُک گئی۔ بس صرف ایک دہلیز پار کرنے کی دیر تھی۔

پھنی بھوشن سے رہا نہ گیا۔ اُس کی رُکی ہوئی آواز فی الفور جوش سے بھرپور
اٹھی ——— وہ بجلی کی مانند برق رفتاری سے چوکی سے اُٹھ بیٹھا۔ اور چلا
اٹھا یہ منی"

فی الفور چونک اُٹھا۔ بیداری میں دیکھا تو اُس کے گلے کی چیخ کی آواز سے
کی کھڑکیاں تک لرز کر چونک اُٹھی تھیں۔ باہر مینڈکوں کی خوب ٹرٹراہٹ تھی
۔ اور ناٹک سے آنے والے لڑکوں کے گیت کی بے سری آوازیں سنائی
دیتی تھیں۔

پھنی بھوشن نے زور سے تھپڑ رسید کیا۔

دوسرے دن ناٹک اُکھڑ گیا۔ میلے کے دوکاندار بھی چلے گئے پھنی بھوشن
نے حکم دیا۔ کہ آج شام کے بعد ہمارے علاوہ اور کوئی مکان میں نہیں رہ سکے گا
نوکروں نے خیال کیا کہ بابو کوئی چلہ کشی کرنا چاہتا ہے۔ پھنی بھوشن نے سارا دن
کھایا پیا نہیں رات کو بھی فاقہ سے رہا۔

سُونے مکان میں شام ہوتے ہی وہ کھڑکی کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ اس دن

آسمان پر کہیں کہیں بادل تھے۔ اور کہیں کہیں دھلی ہوئی ہوا میں ستارے روشن نظر آرہے تھے۔ کرشن پکش کی دشمی تھی۔ چاند نکلنے میں کافی دیر تھی۔ میلہ ختم ہونے سے دریا میں کشتیوں کا نام تک نہیں تھا۔ اور جشن میں بیداری کی وجہ سے دو دن کے تھکے ماندے گاؤں والے نیند میں سرمست ہو گئے تھے۔

بھیبی بھوشن ایک کرسی پر بیٹھا ہوا۔ آسمان کی طرف منہ کئے انجم شماری کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا ——— جب میری عمر انیس برس کی تھی۔ جب کلکتہ کے کالج میں پڑھتا تھا۔ جب شام کے وقت کالج سکوئیر کے باغ میں گھاس پر سر رکھے لیٹے ہوئے آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ تو دریا کے کنارے سسرال کی یاد آتی تھی۔ جہاں ایک خاموش کوٹھڑی میں چودہ برس کی منکا کو جس کی نا پختگی پر وہ رہ رہ کر متوجہ ہوتا تھا۔ اُس وقت ستاروں کی بے پناہ کیفیت سے عالم شباب کیسا تھ ساتھ کیسی بہار افروز گھٹا اٹھتی تھی۔ آج وہی آسمان ہے۔ وہی ستارے ہیں ——— ان ستاروں نے آسمان میں آگ کی چمک پیدا کر رکھی ہے۔ اور کہہ رہے ہیں ——— دنیا بڑی تعجب خیز ہے۔

دیکھتے دیکھتے انجم درخشاں گم ہو گئے۔ آسمان سے تاریکی مٹ گئی۔ زمین سے ایک اندھیرا آسمان کی طرف بلند ہوا۔ آنکھوں کی دونوں پلکوں کی مانند دونوں باہم مل گئے۔ آج بھی بھوشن کا دل بے چین تھا۔ یقیناً وہ جانتا تھا۔ کہ آج اسکی مراد بر آئیگی۔ اور اس کے سامنے موت اپنی آغوش وا کر ڈالے گی۔

کل کی رات کی مانند وہ آواز دریا کے پانی سے نکل کر گھاٹ کی سیڑھیوں پر آئی۔ بھیبی بھوشن دونوں آنکھیں بند کر کے پوری استقامت سے سوچنے لگے

آواز نے آکر اُس کے دروازہ میں او خال پایا اور وہ آواز بغیر محسوس طور پر
ضم سے پلی سیڑھیوں سے گھومتی ہوئی اُوپر چڑھنے لگی۔ آواز طویل برآمدہ کو پار
کرکے آگے آئی ــــ اور خوابگاہ کے دروازہ کے قریب آکر لمحہ بھر کے لئے
ٹھٹک کر رہ گئی۔

پھپنی بھوشن کا دل بے چین ہوگیا۔ سارے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔
آج اُس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ آواز نے دہلیز کو پار کرکے تاریک گھر
میں راہ پائی۔ کھونٹی کے پاس ــــ جہاں منی کی ساڑھی چُنی ہوئی لٹک رہی
ہے ــــ سامنے جہاں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔ تپائی کے قریب
ــــ جہاں پاندان میں پان خشک پڑا تھا۔ اور اُس حیرت افروز اشیاء
سے لبریز الماری کے پاس ہر جگہ ایک ایک بار کھڑے ہو کر آخر کار وہ آواز
پھپنی بھوشن کے پاس ہی آکر تھم گئی۔

اُس وقت پھپنی بھوشن نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا کہ گھر میں دشمی کے چاند
کی بیابار شعاعوں نے راہ پائی ہے۔ اور اُس کی کرسی کے عین سامنے ایک
کنکال کھڑا ہے۔ اس کنکال کی آٹھوں اُنگلیوں میں انگشتریاں چمک رہی ہیں
ہاتھوں میں رتن چکر۔ پاؤں میں کڑے۔ بازوؤں میں بازوبند۔ گلے میں ہار۔ پیشانی
پر ٹیکا۔ اور مانگ میں سیندور ــــ سر سے لیکر پاؤں تک اُس کی ہر ایک
ہڈی میں ہر ایک زیور ہیرے جواہرات کی پُر نُور شعاعیں نکال رہا ہے۔ زیور
ڈھیلے ڈھیلے اور اتنے ڈھیلے کہ کھسک کر گر پڑیں۔ مگر اس کے باوجود اپنی جگہ
سے کھسکتے نہیں ہیں۔ حیرت ناک بھئیں۔ اُس کے ذی روح جسم کی ہڈیوں کے

ڈھانچے پر دو چمکتی ہوئی آنکھیں —— کالی کالی پتلیاں گھنی تپلی پلکیں ہیں۔ تم آلود
اُجالا۔ پرسکوت انداز۔ آج سے اٹھارہ سال پہلے ایک دن ٹھیک جشن اور وزرا گمی
میں پھینی بھوشن نے جو دو بڑی بڑی کالی کالی اُچھلتی ہوئی آنکھیں پہلے پہل دیکھی
تھیں۔ وہ آنکھیں ہی اُس نے آج ساون کی خاموش رات میں آج دشمی
کے چاند میں دیکھیں —— یہ دیکھتے ہی اس کے جسم کا سارا خون ٹھنڈا ہوگیا
آنکھیں بند کرنے کی کافی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اُس کی آنکھیں مُردے
کی آنکھوں کی مانند پتھرا کر رہ گئی تھیں۔

اُس وقت اس کنکال نے متحیر پھینی بھوشن کے چہرہ کی طرف اپنی توجہ پھیر
کر داہنا ہاتھ اُٹھاکر خاموشی سے اُنگلی کا اشارہ کر کے اپنے قریب بلایا۔ اُسکی
چاروں اُنگلیوں کی ہڈیوں میں ہیروں کی انگشتریاں دمک اُٹھیں۔

پھینی بھوشن مبہوت ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کنکال دروازے کیطرف بڑھا۔
ہڈیوں سے دیواروں کے ٹکرانے کی سخت آواز آنے لگی۔ پھینی بھوشن جال میں
پھنسی ہوئی تیلی کی مانند اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ برآمدہ پار کر کے وہ تاریک تر
گول سیڑھیوں سے گھومتا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ پھر نیچے کا برآمدہ
پار کر کے تاریک ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ آخرکار وہاں سے آگے بڑھ کر سنسان
باغیچے کے راستہ باہر نکل گیا۔ فرش زمین پر ہڈیوں کے پاؤں کی آواز آنے
لگی۔ روشنی درختوں کے پتوں کو چیر کر اس طرح پار ہو رہی تھی۔ جیسے آزادی
کے لیئے تڑپ کر ان بھیدوں سے باہر آنا چاہتی ہے۔ بارش کے اس تاریک
اور خاموش عالم کے راستہ سے جگنوؤں کے جھنڈ کو پار کر کے دونوں دریا کے

گھاٹ پر پہنچے۔

گھاٹ کی جن سیڑھیوں سے آواز بلند ہوئی تھی۔ ان ہی سیڑھیوں سے زیورات سے ملبوس کنکال اپنی پُرسرور رفتار سے ایک ایک قدم اٹھاتا ہوا اُترنے لگا۔ برسات کی بارش سے لبریز دریا کے ساحل سے ایک نقرئی لہر نظر آرہی تھی۔

کنکال دریا میں اُترا۔ بھینی بھوشن کی محویت ختم ہوگئی ——— اب اُس کے سامنے کوئی اس کا راہنما نہیں تھا ——— صرف دریا کے اُس پار درختوں کی قطار خاموشی سے کھڑی تھی۔ اور اُس کے سر پر چاند کا سنہری ٹکڑا خاموشی سے ساری کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔

بار بار حیرت سے اپنے آپ کو دیکھ کر لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں سے آگے بڑھ کر بھینی بھوشن دریا کے بہاؤ میں جا گرا۔ اگرچہ وہ تیرنا جانتا تھا۔ مگر اپنے جسم پر اُس کا قابو نہیں تھا۔ خواب کے عالم سے صرف ایک لمحہ کے لئے بیداری کے کنارے آکر دوسرے لمحہ میں ہمیشہ کے خواب یا نیند میں محو ہوگیا۔

کہانی ختم کرکے ماسٹر صاحب تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ اچانک یہ معلوم ہُوا۔ جیسے اس دوران میں دُنیا کی ہر ایک شے پر عالم حیرت طاری ہوگیا ہے۔ کافی دیر تک میں کچھ نہ بولا۔ اور تاریکی میں وہ میرے چہرہ کے آثار تک نہ بھانپ سکا۔

اُس نے پوچھا ——— کیا آپ کو اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔؟

میں نے کہا ——— کیا آپ اسے سچی سمجھتے ہیں؟

اُنہوں نے کہا ــــــ "نہیں تو۔ کیوں نہیں۔ اس کی وجہ بتاتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ قدرت کوئی ناول نگار نہیں ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کافی کام ہیں۔"

میں بول اُٹھا ــــــ "میرا ہی نام پھینی بھوشن ہے۔

سکول ماسٹر نے ذرا بھی نادم نہ ہو کر کہا ــــــ "تو میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ آپ کی گھر والی کا نام کیا تھا۔؟"

میں نے کہا ــــــ "نمہتنہ کالی۔"

ٹیگور

دُلہن

(۱)

سوہی!

سو جاؤ، تین رات ہونے کو آئی ہے۔

ہونے دو رات میرے دن تو اب بہت نہیں ہیں۔ میں کہہ رہا تھا منی کو اپنے باپ کے پاس ـــــ بھول رہا ہوں۔ اس کے پتا آجکل کہاں ہیں ـــــ

سیتاپور

ہاں سیتاپور۔ منی کو وہاں بھیجدو۔ اور کے دن وہ بیمار کی عیادت کریگی؟ اُس کا جسم تو ایسا تندرست نہیں ہے۔

سُنو تو سہی! تمہیں اِن حالات میں چھوڑ کر بہو جانا ہی کیوں پسند کریگی۔ باپ کے گھر؟ ڈاکٹروں کی کیا رائے ہے۔" وہ ـــــ

"نام نہ لو میں ڈاکٹروں کی بات نہیں جانتی"—— آنکھوں سے دیکھ رہی ہے

اُس دن منی کے ساتھ اس سلسلہ میں اس کی جو بات چیت ہوئی تھی۔ وہ اسطرح تھی۔

بہو۔ تمہارے باپ کی طرف سے کوئی خبر آئی ہے شاید؛ تمہارے چیرے بھائی

انا تھ کو جیسے دیکھا ہو۔

ہاں ماں میں نے کہلا بھیجا ہے۔ اگلے شکروار کو چھوٹی بہن کا کھانا کھانے کا پہلا

مُبارک دن ہے۔ اس لئے سوچتی ہوں۔

اچھا تو ہے بیٹیا؛ ایک طلائی ہار بھیجدنیا۔ تمہاری ماں خوش ہو جائیگی؛

سوچتی ہوں میں چلی جاؤں گی۔ اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا نہیں۔ درشن کو جی چاہتا ہے

یہ کیسی بات ہے۔ بتین کو اکیلی چھوڑ جاؤگی؛ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے۔ سُنا تو ہے؛

ڈاکٹر تو کہتا تھا" ابھی ایسا کچھ خاص——"

کہنے دو اُس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے جاؤگی کیسے؛

ہمارے بتین بھائیوں کی یہی ایک بہن ہے۔ بڑی دُلاری —— سُنا ہے اس

موقعہ پر خوب دُھوم دھام سے جشن ہوگا —— میرے نہ جانے سے ماں بہت۔

تمہاری ماں کا خیال۔ بیٹیا میں کہہ نہیں سکتی۔ لیکن بتین کی اس حالت میں اگر

چلی جاؤگی۔ تو تمہارے پتا ضرور غصہ کریں گے۔ یہ میں کہہ سکتی ہوں۔

یہ جانتی ہوں۔ تمہیں صرف ایک چٹھی لکھنی ہوگی۔ کہ کوئی فکر کی بات نہیں ہے

—— میرے جانے سے کوئی خاص ——

تمہارے جانے سے کوئی نقصان ہی نہیں ہے۔ یہ پتہ نہیں ہے؛ لیکن اگر تمہارے

پتا کو کچھ لکھنا اچھا۔ تم لکھ ہی دنیا۔ انہیں جاکر بتانے سے وہ ——

"دیکھو بہو۔ کافی برداشت کیا ہے ——— لیکن اسے لیکر اگر تم بیتین کے پاس جاؤگی تو کسی طرح برداشت نہیں کر سکونگی۔

یہ کہہ کر موسی چلی گئی۔ منی کافی دیر تک ناراضگی سے بستر پہ ہی دراز رہی۔

پڑوسی کے گھر سے سہیلی نے آکر دریافت کیا۔ سہیلی یہ کیا! کس پر غصہ ہے؟

دیکھو تو بھائی۔ میری ایک بہن ——— یہ لوگ مجھے جانے نہیں دیتے۔

ارے ماں۔ یہ کیسی بات ہے جاؤگی کہاں؟ بچی تو بیمار پڑا ہے؟

میں تو کچھ نہیں کرتی۔ کر بھی نہیں سکتی۔ گھر میں تو سب لوگ خاموش ہیں۔ میرا تو جی ہانپ اُٹھا ہیں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

تم اچھی استری ہو۔

میں تو بھائی دوسروں کی طرح لوگوں کو دکھانے کا بہروپ نہیں بھرتی۔ بعد کو کوئی کیا خیال کریگا۔ اس لئے خاموشی سے منہ پہ مُہر لگا کر پڑے رہنا میرا کام نہیں ہے۔

تو کیا کروگی سُنوں تو سہی؟

میں جاؤنگی ہی۔ مجھے کوئی پکڑ کر کیسے رکھ سکتا ہے۔

ہُنہہ! رعب دیکھ کر ہی زندگی ہلکان ہوتی ہے۔ میں جاتی ہوں میرا تو کام ابھی باقی ہے

(۲)

پتنا کے گھر جانے کا ذکر سُن کر منی رونے لگ گئی تھی۔ اس خبر سے مبہوت ہو کر بیتین سرہانہ بیٹھ کی طرف اٹھا کر رکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ بولا۔ یہ کھڑکی ذرا اور کھول دو۔ اس چراغ کی اس کمرہ میں ضرورت نہیں ہے۔

کھڑکی کھولتے ہی خاموش اور تاریک رات تھکے ماندے مسافر کی طرح بیمار کے

دروازہ کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ لاانداز زمانہ کے موت کے شاہد ونکی طرح آسمان کے تارے یتین کے مُنہ کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

یتین نے جس طرح اس شبِ تار کے طاق پر اپنی منی کا پیارا مکھڑا دیکھا دونوں بڑی بڑی آنکھیں جسطرح بڑی بڑی آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی ہیں ——— وہ آنسو جس طرح ٹپک ہی نہیں سکتے ہمیشہ کے لئے چھلکتے ہوئے رہ گئے ہیں۔

اُسے کافی دیر تک خاموش دیکھ کر موسی بے فکر ہوگئی۔ سوچا یتین کو نیند آگئی ہے اُسی وقت اچانک وہ کہہ اُٹھا ——— موسی تم تو ہمیشہ کہتی آئی ہو کہ منی کا دِل چنچل ہے ——— ہمارے لئے اس قدر دیر نہیں لیکن دیکھو ———

نہ بیٹا میں نے غلط خیال کیا تھا ——— وقت آنے پر ہی آدمی کو پتہ چلتا ہے۔

موسی۔

یتین سو جاؤ بیٹا۔

مجھے ذرا سوچنے دو ——— کچھ کہنے دو ——— ناراض نہ ہونا موسی۔

اچھا کہو بیٹا۔

میں کہہ رہا تھا۔ آدمی کو اپنے دل کی باتیں سمجھتے ہوئے کسقدر وقت خرچ آتا ہے۔ ایک دن جب ہم خیال کرتے تھے۔ منی کا دِل ہی قابو میں نہیں لے سکے تو میں نے خاموشی سے سب کچھ برداشت کیا۔ تم اسوقت ———

نہ بھائی۔ یہ مت کہو ——— میں نے بھی برداشت کیا ہے۔

دل مٹی کا ڈھیلا نہیں ہے ——— اپنے تو ہاتھ میں آنا مشکل ہے۔ میں خیال کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا۔ منی خود بخود اپنے آپ کو سمجھ نہیں سکی ——— جس دن چوٹ

لگے گی۔ اُس دن بھر ـــــ
ٹھیک ہے یتین۔
اسی لئے اس کے لڑکپن کی طرف میں نے کبھی کوئی خیال ہی نہیں کیا۔
موسی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا ـــــ صرف جی ہی جی میں طویل سانس لی۔ کتنے دن تک اُنہوں نے اندازہ کیا یتین نے برآمدہ میں ہی رات بسر کردی ہے۔ پانی کی بوچھاڑ پڑتی رہی ہے۔ تو بھی گھر نہیں گیا ہے۔ کتنے ہی دن وہ سر درد کے بہانے بچھونے پر جا لیٹا ـــــ تنہائی کی خواہش ہے۔ کہ منی آکر ذرا سر پر ہاتھ پھیر دے گی۔ مگر منی اسوقت سہیلیوں کے ہمراہ تھیٹر جانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ موسی یتین کو پنکھا کرنے آئی ہے۔ انہیں اس نے ناراض ہوکر واپس کر دیا ہے۔ اس ناراضگی میں کسقدر تڑپ رہتی تھی۔ اُنہیں اس کا علم تھا۔ کتنی دفعہ اس نے یتین سے کہنا چاہا ـــــ بیٹا تم اس چھوکری کو دیکھ کر دل پر قابو رکھنا۔ وہ ذرا چاہنا بھی سیکھے۔ آدمی کو تھوڑا ادولانا چاہیئے۔ مگر یہ سب باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں اور کہنے پر کوئی سمجھتا بھی نہیں۔ یتین کے جی میں استری کا تاریک پہلو تھا۔ وہاں ہی اس نے منی کو جگہ دی ہوئی تھی۔ اُس کے مبارک خیال میں عورت کی قسمت تاریک ہی رہیگی ـــــ یہ سوچنا یتین کے لئے سہل نہیں تھا۔ اسی لیے خدمت کرتا تھا۔ پانی بھرتا مگر امید منقطع ہی نہیں ہوتی تھی۔ موسی جب پھر حیران ہوکر سوچ رہی تھی۔ کہ یتین سو گیا ہے۔ اُس وقت وہ اچانک کہہ اُٹھا۔
مجھے معلوم ہے۔ تمہارا خیال تھا۔ منی کو لیکر میں سکھی نہیں ہو سکا۔ اسی لئے تم اُس پہ ناراض رہتی تھی۔ مگر موسی سُکھ نام کی چیز آسمان کے تاروں کی طرح ہے

جن سے تاریکی فنا نہیں ہو سکتی۔ زندگی میں بیشمار غلطیاں ہوتی ہیں۔ کئی بار غلط خیال کرتے ہیں۔ تو بھی راحت کا چراغ روشن نہیں ہوتا۔ نہ معلوم آج کیوں میرا قلب تاریک پھر مسرت سے ضیا پاش ہو اٹھا ہے۔

موسی آہستہ آہستہ بیتین کے رخساروں پر اپنا محبت کا ہاتھ پھیرنے لگی تاریکی میں اس کی دونوں آنکھوں سے جو آنسو چھلک کر بہہ رہے تھے۔ انہیں کوئی دیکھ نہ سکا۔

موسی میں سوچ رہا ہوں۔ اس کی عمر کچی ہے۔ ہم نے بھی تو بیٹا اسی عمر میں پاکیزہ خیالات کو دل میں جگہ دی تھی ——— اس سے کیا کوئی نقصان ہوا؟ اور میں تو یہ بھی کہتی ہوں کہ آخر آرام کی ضرورت ہی کیا ہے؟

موسی جو نہیں منی کے بیدار رہنے کا وقت ہوا تو میں ———
اتنی فکر کیوں کرتے ہو؟ اگر دل بیدار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر خوشی ہی کیا ہے؟ اچانک کافی دیر کا ایک اپنا بھولا ہوا گیت یاد آ گیا۔

موسی کیا وقت ہے؟

نو بجنے والے ہیں۔

صرف نو؟ میں سمجھ رہا تھا۔ دو تین یا ایسے ہی کچھ وقت ہو گا۔ شام کے ساتھ ہی میری شب تار طویل ہونی شروع ہو جاتی ہے ——— آپ میری نیند کے لئے اس طرح بےچین کیوں ہوتی ہیں؟

کل بھی شام کو باتیں کرتے کرتے آپ کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی ——— اس لئے آج تمہیں پہلے ہی سو جانے کو کہہ رہی ہوں۔

منّی کیا سو گئی۔

نہیں وہ تمہارے لئے مسور کی دال کا پانی تیار کر کے سونے جائیں گی۔

کہتی کیا ہو۔ موسی منی کیا اس وقت ——

وہی تو اس وقت تمہارا کھانا بناتی ہے۔ اُسے بالکل چین نہیں ہے؟

میں سمجھتا تھا منی شاید ——

لڑکیوں کو کیا یہ سب کام سیکھنا پڑتا ہے مصیبت سر پہ آتے ہی سب سیکھ لیتی ہیں۔

آج دوپہر کو جب مُرلی مچھلی پکا رہا تھا۔ اس میں ایک بڑا لذیذ ذائقہ تھا میں خیال کر رہا تھا۔ تمہارے ہی ہاتھ کی بنی ہو گی؟

یہ میری کہاں قسمت! منی کچھ کرنے بھی دے؟ تمہارا رومال تک خود دھو کر صاف کرتی ہے۔ جانتی ہے تم صفائی کے دلدادہ اور ناپاکی کے دشمن ہو۔ اپنی نشست تک جاؤ تو پتہ چلے کہ روزانہ صبح شام اُس کو جھاڑ پھونک سے ایسا صاف رکھا ہے۔ کہ دمک رہا ہے۔ اور جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر میں اُسے تمہارا کمرہ سپرد کر دوں تو پھر کتنا خوشنما بن جائے۔ وہ تو یہی چاہتی ہے۔

منی کی طبیعت شاید ——

ڈاکٹر کہتے ہیں بیمار کے کمرہ میں اُسے ہمیشہ آنے جانے میں شاید —— ویسے کچھ نہیں ہے۔ لیکن اُس کا دل بڑا حساس اور نرم ہے۔ تمہاری تکلیف کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ صرف دو دن میں ہی تھک کر چور ہو جائے اور دل توڑ بیٹھے۔

موسی تم اسے کس طرح بُلاتی ہو؟

مجھے وہ بہت مانتی ہے۔ اس لئے بلا لیتی ہوں۔ اس کے باوجود بھی اُسے

چند ساعت بعد خبر دیتی رہتی ہوں ـــــ یہ میرا ایک زائد کام ہے۔

آسمان پر انجم درخشاں تالاب کے پانی کیطرح چھلک رہے تھے۔ جو زندگی آج وداع ہونے کے لئے برسرراہ ہے۔ بتین نے اُسے جی ہی جی سے پرنام کیا ـــــ اور سامنے تاریک رات کی طرف موت کے داہنے ہاتھ میں پورے یقین سے اپنا کمزور ہاتھ رکھدیا۔

ایک دفعہ لمبی سانس لیکر قدرے ہوشیاری سے بتین بولا۔ منی اگر جاگتی ہو تو اسے ایک بار ـــــ ابھی بلا دیتی ہوں بیٹا۔

میں اُسے اس کمرہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہراؤنگا ـــــ صرف پانچ منٹ ـــــ دو ایک باتیں کہنی ہیں ـــــ

موسی لمبے سانس بھرتی منی کو بلانے چلی گئی۔ بتین کی حرارت تیز ہو رہی تھی۔ اُسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ابھی تک منی سے اچھی طرح بات چیت بھی نہیں کر سکا۔ وہ بلجے اگلی دو سُمروں میں بندھ گئے۔ ایک ساتھ الاپنا مشکل ہے۔ منی اپنی سہیلیوں کیساتھ بیہودہ بکواس کرتی جارہی ہے۔ دُور سے تصور کے عالم میں اُس کا جی بے چین ہو گیا اُس نے اپنے آپ کو ملزم گردانا ـــــ کیوں نہیں معمولی سی بات بھی کر سکتا ـــــ نہیں کر سکتا ـــــ یہ بھی تو جرأت نہیں ہے۔ اپنے گھر میں وہ معمولی امور پر بات چیت کے لئے مُنہ نہیں کھولتا ہے۔ لیکن مردوں اور عورتوں کی باہمی ہستی متوازی نہیں ہے۔ بڑے بڑے امور پر اکیلے ہی کہنے سے بعض اوقات کام چل جاتا ہے۔ دُوسری طرف کا خیال کرنے کی ضرورت لاحق ہی نہیں ہوتی ـــــ بنسری اکیلی ہی بجتی لیکن دو ہاتھوں کے بغیر تالی نہیں بجتی۔ اس لئے کتنی راتوں تک اکیلے بتین منی

راہ محو گفتار رہا ہے۔ اور اسی دوران ہی چند لمحات میں ہی گفتگو کا سلسلہ بگڑ
ٹوٹ گیا ہے۔ ختم ہو گیا ہے۔ اُسے یہ محسوس ہوا۔ کہ شام کی ندامت آمیز سیاہی
میں جذب ہو جائے تیتن نے خیال کیا کہ منی اگر بھاگ جائے۔ تو جان میں جان آجائے
یکسوئی سے یہ خیال کیا کہ اس وقت اگر کوئی تیسرا آدمی درمیان میں آجاتا۔ تو
بہتر تھا۔ کیونکہ دو نہیں تین آدمیوں کی گفتگو سہل ہوتی ہے۔

منی کے آنے پر آج کس طرح گفتگو شروع کریگا۔ تیتن یہ سوچ رہا تھا سوچتے
سوچتے شاید کسی طرح احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتے ـــــ وہ کامیاب نہیں
ہوتا۔ تیتن کو شبہ لاحق ہوا ـــــ آج کی رات کے پانچ منٹ بھی فضول جائیں
گے۔ تاہم اس کو زندگی میں اس قسم کے بیکار یہ پانچ منٹ کتنے ہی گذر چکے ہیں

(۲)

یہ کیا بہو کہیں جا رہی ہو گیا؟

سیتا پور جاؤنگی۔

یہ کیوں؟ کس کے ہمراہ جاؤ گی؟

انا مو لے جا رہا ہے۔

میری خوش قسمت ہو تم بیشک چلے جانا میں بالکل نہ روکوں گی۔ لیکن
آج نہ جاؤ۔

ٹکٹ خرید کر ڈبہ ریزرو کرا لیا ہے۔

تو کیا یہ نقصان ہم برداشت کریں گے ـــــ تم کل صبح سویرے چلی جانا ـــــ
آج نہ جاؤ۔

موسی میں آپ لوگوں کی باتوں کی قائل نہیں ——— آج جانے پہلے کیا ہر رج
یتین نے تمہیں بلایا ہے۔ کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہے۔
اچھا ابھی تھوڑا وقت باقی ہے۔ میں اُن سے مل آتی ہوں۔
دیر نہ کہنا کہ جا رہی ہوں
اچھا۔ کچھ نہ بولونگی۔ لیکن زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتی کل ہی تو پہنچنا ہے۔
اگر آج نجاؤں تو بہتر نہیں۔
میں ہاتھ جوڑتی ہوں بہو۔ آج ایک دن کے لئے میری بات مانو۔ آج قدمے
جی شانت کر کے یتین کے پاس جاکر بیٹھو ——— جلدی کا شور مت مچاؤ۔
تم تیار کیا کیا جائے۔ گاڑی ہمارے لئے بیٹھی رہیگی۔ اناتھ چلا گیا ہے کوئی دس
منٹ بعد ہمیں آکر لے جائیگا۔ اسی دوران میں اُن سے فارغ ہو آتی ہوں۔
نہ۔ تو پھر رہنے دو ——— تم جاؤ۔ اس طرح اسکے پاس تمہیں نہیں جانے دونگی
ارے بدقسمت! تم نے جسے اسقدر دکھ پہنچایا۔ وہ آج نہیں تو کل کا مہمان ہے
——— مگر تو جتنے دن زندہ رہیگی ——— اس دن کی بعد تمہیں مرتے تک یاد رہیگی۔
بھگوان ہی بھگوان ہے آج کے بعد ہی سمجھے گی۔
موسی تم اسطرح غصہ مت کرو۔
واہ رے باپ! میں کس لئے ابھی تک زندہ رہی رے باپ! پاپ کی حد
ہوگئی ——— میں اب برداشت نہیں کر سکونگی۔

موسی ذرا دیر بعد بیمار کے کمرہ میں پہنچی۔ خیال تھا یتین سو گیا ہوگا۔ لیکن کمرہ

ں داخل ہوتے ہی دیکھا۔ وہ بستر پر ہل جُل رہا ہے۔ سویا نہیں۔ موسی نے کہہ دیا
ب نیا و قوعہ کرآئی ہیں۔

کیا ہوا؟ منی نہیں آئی؟ اتنی دیر کیوں لگائی موسی؟

جا کر دیکھا کہ وہ تمہارا دودھ اُبالتے ہوئے جلا بیٹھی ہے اور رو رہی ہے۔
ں نے کہا۔ آخر ہوا کیا؟ اور دُودھ پڑا ہے۔ لیکن لاپرواہی سے تمہارا دُودھ
لا کر شرم کرتی ہے۔ اُسے خُوب سمجھا بجھا کر بستر پر سُلا آئی ہوں۔ آج اس لئے
ہیں لائی کہ تھوڑا آرام کرلے۔

منی نہیں آئی سُن کر جسطرح منی کے دل پر ضرب کاری لگی اور آرام بھی ملا۔ گسے
بہ ہوا۔ کہ کہیں منی آکر اُس کے تصور خیال کو چکنا چور نہ کر ڈالے۔ اس کی زندگی
ں اس طرح کئی بار ہوا۔ دُودھ جلا کر منی کا نرم دل بے چین ہو پڑا۔۔۔ اسی خیال
ے یتین کا دل کئی بار بھر آیا۔

•

موسی!

• •

کیا بیٹا؟

میں خُوب جانتا ہوں میرے دن ختم ہونے کو آگئے ہیں۔ لیکن کوئی دُکھ نہیں۔ تم
یرا افسوس نہ کرنا۔

•

نہ بیٹا میں غم نہیں کرونگی۔ زندگی ہی بشاشت ہے موت نہیں۔ یہ میں نہیں مانتی۔
موسی میں سچ کہتا ہوں۔ موت مجھے لذیذ معلوم ہوتی ہے۔
شب تار کی سیاہی کی طرف یتین کی توجہ تھی۔ اُس کی ممی آج موت کے لباس
ں آگئی ہے۔ وہ آج پُر شباب رعنائی سے گلگوں ہے۔ وہ حاملہ ہے۔ شکیل ہے

خوش بخت ہے۔ اُس کے کھلے سیاہ بالوں پہ آسمان کے تارے ـــــ ہتھل رکے
ہاتھ کی مالا ہیں۔ دونوں کے سر پہ تاریکی کی خوشنمائی میں اُن کا بیاہ ہوا۔ نیا نویلا
رنگ دیکھا۔ نوین کی ترچھی چتون سے رات کی یہ خوفناک تاریکی لبریز تھی۔ اس گھ
کی بیوہ۔ وہ چھوٹی سی منی۔ حقیر سی ہوتے ہوئے آج کائنات کو سمیٹے ہوئے ہے۔
زندگی اور موت کی قیام گاہ پہ آج اُس نے اپنا قبضہ جمایا ہوا ہے۔ سنسان رات
چھلکتے جام کو لاتی ہے۔ یتین نے دست بستہ دل ہی دل میں کہا ـــــ اتنے دنو
بعد نقاب برافگندہ ہوا۔ اس تاریکی میں شعاعِ اُمید نظر آئی ـــــ تم نے کافی رُلایا
ـــــ خوبصورت ہے خوشنما ہے اب زیادہ فریب نہیں دے سکے گی۔

(۴)

تکلیف ہو رہی ہے موسی! لیکن جیسا تم خیال کرتی ہو اس طرح نہیں تکلیف
کی وجہ سے جس طرح میری روح سلب ہوتی جارہی ہے۔ اتنے دنوں تک و
میرے بھاری بھر کم زندگی کے جہاز کے ہمراہ بندھی تھی جس طرح آج بندھن
ٹوٹ گیا ہے جس طرح وہ میرا سارا بار لیکر بہہ چلی ہے۔ دیکھتا تو ہوں لیکن اب
یہ جسم بھی میرا نہیں ہے۔ دو دنوں سے منی کو ایک بار بھی دیکھ نہیں سکا موسی۔
ہیٹھ پیچھے کیا ایک اور سرہانہ رکھ دوں یتین؟
مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے منی چلی گئی ہو ـــــ میری ڈگمگاتی کشتی کیطرح۔
بٹیا ذرا بی دانہ کا رس کھاؤ۔ تمہارا گلا خشک ہو رہا ہے۔
میرا وصیت نامہ کل لکھا جا چکا ہے ـــــ تمہیں دکھا چکا ہوں یا نہیں یاد نہ
آتی۔

میرے دیکھنے کی ضرورت نہیں بیتین۔

جب ماں مرتی تھی۔ میرا اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔ تمہارا ہی کھا کر اتنا بڑا ہوا۔ اسی لئے کہتا تھا ——

یہ تو کیا کہہ رہا ہے بیتین؟ میرا تو ایک چھوٹا سا مکان اور کچھ اثاثہ تھا باقی تو سب تم نے کاروبار سے بنایا۔ لیکن یہ گھر تو ——

کیسا گھر کتنے در و دروازے تم نے بڑھاتے۔ وہ میری ذرا سی جگہ تو اب تلاش سے بھی نظر نہیں آتی۔

منی تمہیں دل ہی دل سے خوب ——

کیا جانتی نہیں ہوں بیتین؟ تم اس وقت ذرا سو جاؤ۔

میں نے سب کچھ سوچکر نام لکھ دیا ہے لیکن رہا سب تمہارا ہی ہوسی وہ تمہاری نافرمانبرداری نہیں کریگی۔

تم اس کے لئے اتنا کیوں سوچتے ہو بیٹا۔

تمہارے آشیرباد سے ہی میرا سب کچھ ہے تم میری وصیت دیکھ کر ایسا کبھی خیال نہ کرنا ——

یہ کیسی بات ہے بیتین؟ تم اپنی چیز منی کو دیئے جا رہے ہو اور میں خیال کرونگی؟ کیا میرا جی ایسا جلا ہوا ہے؟ اپنی چیزیں تم منی کے نام لکھاتے ہو۔ اس میں تمہیں جو راحت ملتی ہے کیا وہ مجھے نہیں ہے؟

مگر تمہیں بھی نہیں ——

دیکھو بیتین! اب تمہیں غصہ کرونگی۔ تو چلا جائیگا اور مجھے رو لے دیکر بھلا دیگا؟

موسی روپے سے بڑھ کر اور تمہیں ــــ

یتین تم نے میرا گھر بھر دیا ہے یہ میری کتی جنموں کی خوش قسمتی تھی۔ اتنے دنوں خوب ہی بھر کر پایا۔ اگر آج میرا دانا پانی ختم ہو جائے تو شکایت نہ کرونگی دید و سب لکھ دو گھر بار۔ گاڑی گھوڑا زمین جائداد۔ گاؤں وغیرہ ــــ جو کچھ ہے۔ سب منی کے نام لکھ دو ــــ یہ میں بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔

کھانے پینے میں تمہاری توجہ بھی نہیں ــــ مگر منی تو کم عمر ہے ابھی ای لئے یہ کہو۔ یتین یہ نہ کہو۔ دھن دولت دنیا چاہتا ہے تو وہ مگر کھانے پینے ــــ کھاؤگی کیوں نہیں موسی!

منی سے نہیں۔ کھا ہی نہیں سکیگی۔ نہیں کھا سکے گی۔ میں کہتی ہوں اُس کے چہرہ پر رغبت کے آثار ہی نہیں ہیں۔ گلا خشک ہو کر لکڑی ہو جائیگا۔ کسی طرح بھی لذت نہیں پائیگی۔

یتین خاموش سُنتا رہا۔ اُس کی فطرت بول رہی تھی۔ منی کے لئے دُنیا بے کیف ہو جائیگی۔ یہ ٹھیک ہے یا غلط۔ باعث مسرت ہے یا غم۔ وہ سوچتے ہوئے کچھ بھی ٹھیک نہیں کر پایا۔ آسمان کے رخشاں ستارے اُس کے کانوں میں داخل ہو کر کہنے لگے۔ یہی تو ہے ــــ ہم تو ہزاروں سالوں سے دیکھتے آرہے ہیں۔ کائنات بھی وسیع و عریض پیمانہ پر یہ فریب زائی کر رہی ہے۔

یتین ایک لمبی سانس لیکر بولا۔ میں دینے کے قابل تو کوئی چیز دے نہیں سکا۔

کیا کچھ کم دیئے جا رہے ہو بھیا؟ گھر بار اور دولت کے بہانے تم اُسے کیا

نہیں دے چلے۔ کیا وہ اسکی قیمت کسی وقت بھی نہیں سمجھ پائیگی۔ جو تم دیئے جا رہے ہے۔
اس کو قبول کرنے کی بھگوان اُسے طاقت بخشے۔ یہی آشیرباد دیتی ہوں۔

تھوڑا اور بی دانہ کا رس دو۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔ کیا کل منی آئی تھی ——
مجھے یاد نہیں آ رہا۔

آئی تھی۔ اُس وقت تم سو رہے تھے۔ سرہانے بیٹھی کافی دیر تک پنکھا کرتی رہی
پھر دھوبی کو تمہارے کپڑے دینے چلی گئی۔

حیرت ہے! معلوم ہوتا ہے اُسوقت میں خواب دیکھ رہا تھا۔ جبکہ منی میرے
کمرہ میں آنے کی خواہشمند ہے —— دروازہ ذرا سا کھل گیا ہے —— وہ واپس
جا رہی ہے لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مگر موسی اتم ذرا زیادتی کر رہی ہو
—— اُسے دیکھنے دو کہ میں مر رہا ہوں —— نہیں تو وہ اچانک موت کا صدمہ
برداشت نہیں کر سکے گی۔

بیٹا تمہارے پاؤں پہ یہ اُونی شال اوڑھ دوں —— پاؤں ٹھنڈے ہو گئے ہیں
یہ موسی جسم پر اوڑھنا اچھا نہیں لگتا۔

تمہیں معلوم ہے یتین یہ شال منی نے ہی تیار کیا تھا۔ کافی دن اور راتیں محنت
کر کے تیار کیا تھا۔ کل ختم کیا ہے۔

یتین نے شال دونوں ہاتھوں میں لیکر کچھ اِدھر اُدھر پلٹا۔ اُسے محسوس ہوا۔
اس کی نرمی منی کے دل کی ملائمیت کا اظہار کر رہی ہے —— اُس نے اچھی
طرح شب بیداری کے بعد اسے تیار کیا —— اُس کے دلی جذبات ہی جیسے
اس میں گونتھے گئے ہیں۔ اسی لئے جب موسی نے شال اُس کے پاؤں پر ڈالدیا۔

اسوقت اُسے احساس ہوا کہ منی راتوں بیدار رہ کر اُس کے پاؤں دبا رہی تھی۔ لیکن موسی میں تو سمجھتا تھا منی سلائی کرنا ہی نہیں جانتی۔ اُسے سینا پرونا بھاتا ہی نہیں ہے
بی لگا کو سیکھنے میں کونسی دیر لگتی ہے؟ اُسے بتایا گیا تھا۔ مگر اس میں اس نے کافی غلطیاں بھی کی ہیں:
غلطیاں ہو جانے دو۔ اسے پیرس کی نمائش میں تو بھیجنا ہی نہیں ہے۔ غلط سلائی کے باوجود میرے پاؤں اور سینہ کا کام خوب اچھی طرح سے چل جائیگا۔

سلائی میں کافی سقم رہ گئے ہیں۔ یہ سوچ کر تیین کو زیادہ مسرت ہوئی۔ بچاری منی جانتی نہیں ہے۔ بار بار غلطیوں کے باوجود پھر بھی کتنے صبر و سکون سے راتوں بیدار رہ کر سلائی کرتی رہی —— یہ تصور اُسے نہایت درد زا اور لذت افروز معلوم ہوا۔ اُس غلطیوں سے اَٹے ہوئے شال کو ایک بار پھر ہمت کر کے اُس نے ہلایا۔

موسی ڈاکٹر شاید زیرین کمرہ میں ہیں؟

ہاں تیین آج رات رہیں گے۔

تاہم مجھے آج کی رات خواب آور دوائی نہ دینا۔ دیکھا بھی ہے کہ اس سے مجھے نیند تک نہیں آتی۔ بلکہ تکلیف بڑھ جاتی ہے مجھے اچھی طرح بیدار رہنے دو پیارا موسی! بلیسا کہ کی دوادشی کی رات کو ہمارا بیاہ ہوا تھا —— کل وہی دوادشی آرہی ہے —— بلکل اسی وقت آسمان کے سب ستارے تاریک

دیئے جائیں گے۔ منی کو شائد یہ یاد نہیں —— میں اُسے یہی بات یاد کرانا چاہتا ہوں۔ —— تم اُسے صرف دو منٹ کے لئے بلا دو۔ خاموش کیوں رہ گئی؟
شائد ڈاکٹر نے تمہیں کہہ رکھا ہے۔ کہ تمہارا جسم کمزور ہے۔ اس وقت جس سے میرے دل میں کوئی —— ہاں میں تمہیں ٹھیک بتاتی ہوں۔ موسی! آج رات کو اُس سے دو باتیں کر لینے سے میرا جی کافی تسکین پائیگا۔ شائد پھر خواب آور دوا دینے کی زیادہ ضرورت نہ پڑے۔ میرا جی اُس سے چند باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ اسی لئے مجھے دو راتوں سے نیند نہیں آئی۔ اسی لئے میں منی کو بلا رہا ہوں۔ مجھے آج محسوس ہو رہا ہے۔ کہ جیسے بھرا ہوا جی اُس کے سپرد کر سکونگا۔ اُس سے کتنا عرصہ کتنی ہی باتیں کرنے کی خواہش ہوئی۔ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اب صرف ایک لمحہ کی دیر مت کرو۔ موسی! اُسکو ابھی بلا دو —— اس کے بعد مجھے پھر وقت نہیں ملیگا —— نہیں موسی! تمہارا یہ رُلانا میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اتنے دن تو تم صابر تھی۔ آج یہ کیا ہو رہا ہے؟

ارے بیٹیں! سوچتی تھی۔ میرا سارا فرض ادا ہو گیا —— لیکن دیکھتی ہوں۔ اب بھی کافی کچھ باقی ہے۔ آج تو برداشت نہیں ہو رہا ہے۔
منی کو بلا دو —— اُسکو کہہ دوں کل کی رات کے لئے جس سے —— جاتی ہوں بیٹا —— شمبو دروازہ کے پاس ہے۔ اگر کوئی ضرورت پڑے تو پکار لینا۔

موسی منی کی خوابگاہ میں جاکر فرش پہ بیٹھ گئی۔ اور چِلّا کر کہنے لگی —— اور دی

آ ایک بار آ۔ اور اُمتنی جس نے تجھے اپنا سارا اثاثہ دے دیا ہے اُسکی آخری بات

سُن جا ـــــ وہ خود مر رہا ہے۔ اور مت مارو۔

یتین پاؤں کی آہٹ سُن کر چونک پڑا۔ بولا ـــــ منی

میں ہوں شمبو۔ مجھے آپ نے پکارا تھا؟

ایک بار اپنی بہو ٹھکرانی کو بلا دو۔

کِس کو؟

بہو ٹھکرانی کو۔

وہ تو ابھی واپس نہیں آئی۔

کہاں گئی ہے؟

سیتا پور۔

آج گئی ہے؟

آج تین دن ہو گئے ہیں۔

لمحہ بھر کے لئے یتین کا سارا جسم تھرّا اُٹھا ـــــ آنکھوں میں تاریکی چھا گئی۔

اتنی دیر سے تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا۔ اب لیٹ گیا۔ پاؤں پہ وہی اُونی شال

پڑا ہوا تھا ـــــ اُسے پاؤں سے ڈھونپ دیا۔

کافی دیر بعد جب موسی آئی۔ یتین نے منی کا کوئی ذکر نہ کیا۔ موسی نے خیال کیا

وہ بھول گیا ہے۔

اچانک یتین نے ایک بار کہا ـــــ موسی تمہیں کیا اپنے اُس دن کے

خواب کا ذکر نہیں کیا تھا۔!۔

کونسا خواب؟

وہی ——— منی جس طرح کمرہ میں آنے کیلئے دروازہ کھول رہی ہے ——
کسی کے کواڑوں سے اتنی زیادہ دراز نہیں دیکھی تھی۔؟ وہ باہر سے دیکھتی ہے
لیکن کسی طرح اندر نہیں آسکتی۔ منی ہمیشہ کے لئے ہمارے دروازہ کے باہر ہی
کھڑی رہ گئی۔ اُسے کافی پکارا لیکن اُس کی باریابی نہ ہوسکی۔

موسی خاموش رہی۔ سوچنے لگی۔ کہ بتین کے لئے جو باطل فسانہ تیار کر رہی ہوں
وہ دیرپا نہیں ہے۔ دُکھ جب آئے اُسے لبیک کہنی چاہیئے۔ دھوکے کی مدد سے
قسمت کی ضرب کو دُور کرنا بے مطلب ہے۔

موسی! تم سے جو پیار پایا ہے وہ کتنے ہی جنموں میں نہیں مل سکے گا۔ اسی سے
میں اپنی ساری زندگی کو بھر کر جا رہا ہوں۔ اگلے جنم میں ضرور تم میری لڑکی بنو گی۔
میں تمہیں چھاتی سے لگا کر پرورش کرونگا۔

کہتا کیا ہے بتین۔ پھر لڑکی کا ہی جنم لینا ہوگا۔؟ —— نہ ہو تیری گود میں لڑکا
بن کر جنم لوں —— ایسا ہی خیال کرنا۔

نہ نہ لڑکا نہیں نہ بچپن میں جیسی خوشنما تھی۔ اُسی طرح خوش اندام بن کر میرے
گھر آنا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں کس طرح زینت افروز کرونگا۔

اب نہیں بتین ——— تھوڑے سو جاؤ۔

تمہارا نام ——— لکشمی رانی۔

یہ تو آج کل کا نام ہوا۔

نہیں آجکل کا نہیں۔ موسی تم میری گذشتہ کی یاد ہو۔ وہی گذری ہوئی زندگی

لیکر آنا۔

تیرے گھر لڑکی کا بوجھ اور مصیبت لیکر آؤں ——— میں تو یہ خیال بھی نہیں کر سکتی۔

موسی تم مجھے کمزور خیال کرتی ہو۔ مجھے دُکھ سے بچانا چاہتی ہو؟

بیٹا میرا غورت کا دل ہے کمزور؟ اس لئے ڈرتے ہوئے ہمیشہ میں مصیبت سے دُور رہنا چاہتی ہوں۔ مگر میری طاقت اور بساط ہی کیا ہے؟ کچھ بھی تو کر نہیں پاتی

موسی اس زندگی کی ہدایت اسی زندگی میں عمل میں لانے کا وقت نہیں ملا۔ مگر یہ سب اکٹھا کیا گیا ہے جلدی میں آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ دکھا دو گی۔ دیر تک اپنا ہی تصور بنائے رکھنا ایک قسم کی بطالت ہے۔

خواہ کچھ کہو بیٹا۔ تم نے خود کچھ نہیں لیا۔ دوسروں کو ہی بانٹتے آئے۔

موسی ایک بات کا غرور میں ضرور کر سکتا ہوں۔ آرام کے لئے میں نے زبردستی نہیں کی ——— کسی دن میں نے یہ نہیں کیا کہ جہاں میرا حق ہے وہاں زور لگا دُنگا۔ لاحاصل کی فکر نہیں کی۔ وہ شئے چاہی جس پر کسی کا حق نہیں ہے۔ ساری زندگی ہاتھ جوڑے صرف راستہ ہی دیکھتا رہا۔ باطل کا گرویدہ نہیں رہا۔ اتنا عرصہ یوں بے دست و پا رہا ——— اب کے شاید حق کی ضیا پاشی ہو۔ وہ کون ہے

——— موسی وہ کون ہے؟

کہاں؟ کوئی نہیں نہیں؟

موسی تم ذرا ایک بار وہ کمرہ تو دیکھ آؤ۔ میں نے جیسے ———

نہ بیٹا کوئی نظر نہیں آتا۔

لیکن میں نے جس طرح صاف ــــ

کچھ نہیں۔ یہ دیکھو ڈاکٹر بابو آئے ہیں۔

دیکھئے آپ کے قریب رہنے سے وہ زیادہ بولتے رہتے ہیں۔ اتنی راتوں سے بیداری رہی۔ آپ سونے جائیں۔ ہمارا وہ آدمی یہاں رہیگا۔

نہ موسی تمہیں جانے نہیں دونگا۔ نہ نہ تم میرے قریب بیٹھی رہو ــــ میں تمہارا ہاتھ کسی طرح نہیں چھوڑتا ــــ آخری دم تک نہیں۔ میں تمہارے ہاتھوں میں پڑا ہوا تمہارے ہاتھوں میں ہی بھگوان بلالے۔

اچھا۔ لیکن اب بات چیت نہ کریں میں بابو دوا پلانے کا وقت ہوگیا۔

وقت ہوگیا؟ غلط۔ وقت گذر گیا ــــ اب دوا پلانا تو دل لگی ہے۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موسی یم کا علاج ہو رہا ہے۔ اتنے ڈاکٹر کیوں اکٹھے کئے ہیں ــــ سب کو واپس کر دو۔ واپس ــــ اس وقت میری مددگار تم ہی ہو ــــ مجھے اور کسی کی ضرورت نہیں۔ کسی کی نہیں۔ کسی کی نہیں۔

آپ کی تحریک تو بہتر نہیں ہے۔

تو چلے جاؤ ــــ مجھے تحریک مت دو۔ موسی! ڈاکٹر گیا؟ اب تم اس بستر پر آکر بیٹھو ــــ میں ذرا تمہاری گود میں سر رکھ کر لیٹ لوں۔

اچھا بیٹا۔ میرا راجہ بھیا۔ سو جاؤ۔

نہ موسی! سونے کو نہ کہو ــــ سوتے سوتے شاید پھر کبھی نیند ہی نہ ٹوٹے ابھی مجھے زیادہ بیداری کی احتیاج ہے آہٹ نہیں سنتی ہو؟ وہ آرہا ہے۔ ابھی آجائیگا۔

(۵)

بٹیا بیتین ذرا ادھر دیکھو ـــــ یہ دیکھو آگئی ہے۔

کون آیا ہے؛ خواب ہے کیا؟

خواب نہیں بٹیا۔ منی آئی ہے ـــــ تمہارے سسر آئے ہیں۔

تم کون؟

پہچانتے نہیں ہو بھیا۔ وہ تیری منی ہے۔

منی؛ کیا وہ دروازہ کھل گیا ہے۔

نہ موسی میرے اوپر پردہ شال مت ڈالنا وہ باطل فریب ہے۔

شال نہیں ہے بیتین۔ بہو تمہارے پاؤں پڑی ہوئی ہے ـــــ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر ذرا آشیرباد دیدو ـــــ اس طرح مت رو بہو۔ رونے کا وقت آدھا ہے ـــــ ابھی ذرا خاموش رہو۔

ٹیگور

برتھ کنٹرول

مدھوسودن نے اکیسویں برس میں قدم رکھا تھا۔ اور بی اے پاس کر لیا تھا۔ ماں، بوآ، اور دادی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ باپو جی بھی اب زیادہ متفکر ہو گئے تھے۔

یہاں تک کہ ریلوے کے ضعیف العمر ریٹائرڈ کلرک ہمسایہ باپو رنگی لال جو ہمیشہ مدھوسودن کو مجرد رہنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اب اس کے برعکس مشورہ دینے لگ گئے۔ اسی لئے مدھوسودن پر جو بھوت سوار ہو اٹھا۔ اس کی وجہ سے وہ بیاہ کا نام سن کر کباب ہو جاتا تھا۔ بڑے بزرگوں کو آنکھیں نکال نکال کر اور چھوٹوں کو ڈرا دھمکا اور ہم عمر دوستوں کو دلیل اور حجت سے شادی کے متعلق خوفناک باتیں کہتا ہوا منہ بند کرتا تھا۔

ماں، بوآ، دادی کبھی خوش اندام، ملیح غزالہ چشم دوشیزہ کا ذکر چھیڑتیں تو

کھانا چھوڑ کر چل دیتا تھا۔

بابوجی سمجھدار تھے۔ وہ اُس سے کم باتیں کیا کرتے تھے۔ اسی لئے مدھوسودن بھی اُن کی عزت کرتا تھا۔ بیاہ کے متعلق بلا وجہ ذکر چلا کر بابوجی بھی اُس سے عزت کو فضول ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

لیکن مدھوسودن اب رنگی لال کے قریب بھٹکتا نہیں۔ اُن سے خائف ہے مگر اُن کی ہدایتوں سے انکار کرنا بھی اُسے منظور نہیں ہے۔

بابوجی نے اچانک ایک دن رنگی لال سے ذکر چھیڑ دیا۔ اور دونوں بوڑھے بلکہ ایک تجویز پر متفق ہو گئے۔

(۲)

کھانا کھا کر اُس دن رنگی لال بازار نہ گئے۔ مدھوسودن دکھائی دیا اپنی عادت کے خلاف آواز دیکر اُسے قریب بلا لیا۔

اس طرح شوخی تہذیب سے دُور غرور اور تکبر تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے مدھوسودن آواز سُن کر آ گیا۔

کہو بھائی ایم اے میں داخل ہو گئے؟ — رنگی لال نے حقہ کی نال لبوں پر رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

رنگی لال نے اس قسم کی بات نہ چلائی لیکن چلائی تھی۔ مدھوسودن نے ایسے وہ بولا — "جی ہاں میرا ارادہ تو ہے"

"تمہارا ارادہ ہے تو روکاوٹ ہی کیا ہے؟"

پتا جی۔

ہاں۔

پتاجی۔

ہاں۔

اور سب لوگ۔

ہاں کیا ہے؟"

یہی سب لوگ تنگ کرتے ہیں ——— بیاہ کر لو۔ بیاہ کر لو ——— میرے خیالات آپ جانتے ہیں"

کیا اب تک اپنے خیالات پر ڈٹے ہو۔؟

"جی ہاں" ——— مدھوسودن کی آنکھیں حوصلہ سے چمک اٹھیں ——— "مجھے بھی کیا آپ نے ایسا ویسا سمجھ لیا ہے؟ میں بیاہ کر کے رکاوٹ کیوں خرید لوں۔ میں خدمت وطن کی راہ میں کانٹے نہ بکھیر ڈالوں۔ غلام اولاد پیدا کر کے زمین بوجھ نہیں بڑھاؤنگا۔

رنگی لال نے کہا ——— شاباش! شاباش! آج تم نے میری طبیعت خوش دی ہے۔ واقعی تمہارے جیسے نوجوان ہی دنیا میں کچھ کر سکتے ہیں۔

مدھوسودن یہاں سے چلا تو خوشی اور غرور اس کی شکل و صورت سے ٹپک رہا تھا۔

(۳)

وہ ——— لڑکی سب کو پسند آئی ہے۔ میٹرک پاس ہے۔ خوش نما اور پرکشش صورت۔ مکھن کی طرح شفاف چہرہ آہو چشم گل نرگس کو عرق ندامت میں شرابور کر دینے والا

ایک ایک اعضا۔ جیسے صانع ازل نے اُسے اپنے ہاتھوں سانچے میں ڈھال کر تیار کیا ہے۔ یہی نہیں لڑکی کے ماں باپ حد سے زیادہ شریف ہیں سر پٹخ رہے ہیں۔ ایک ہی لڑکی ہے ـــــ سارا اثاثہ لے لو۔ لڑکے پر فدا ہیں۔ وہ خواہ لڑکی کو دیکھ لے گفتگو کرلے۔ جانچ لے، سمجھ لے، اور ٹھونک بجالے۔ ماں، دادی، بوآ اور باورچی ـــــ سب لڑکی کو دیکھ چکے ہیں۔ اور پسند کرچکے ہیں۔

سب مدھوسودن کے خبط کو دیکھ رہے ہیں۔ اور چُپ چاپ تجویزیں کر رہے ہیں۔ اس لڑکی کا ذکر بیٹے سے کرنے کا بیڑا ماں، بوآ، دادی کوئی نہ اُٹھا سکی۔

انہیں دنوں بوڑھوں کی تجویزوں میں اتفاق ہوگیا۔

متفقہ تجویز کی سازش کو کامیاب بنانے کی تیاریاں سرگرمی سے جاری ہونے لگی ہیں

(۴)

وہ دُور کے رشتہ میں کوئی موسی لگتی ہے۔ آج ایک ہفتہ سے آئی ہوئی ہے بچاری غریب ہے۔ سامان وغیرہ کچھ ساتھ نہیں ہے۔ دو ایک دن پہلے ذکر ہوا تھا۔ اور پھر وہ ایک دن گاڑی میں بیٹھے خود ہی آگئی۔ کپڑوں کی ایک گٹھڑی اور ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی اُس کے ہمراہ تھی۔

پہلے تو کبھی اس موسی کو مدھوسودن نے دیکھا نہیں تھا۔ اور نہ ہی اُس کے متعلق کبھی ذکر آیا تھا۔ ہوگی کوئی! ابھی تک اُسے گھریلو معاملات سے واقف ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب تک تو وہ کتابیں ٹینس اور [illegible] کو لیکر ہی پاگل بنا رہا تھا۔

لیکن یہ لڑکی ـــــ

یہ لڑکی تو اُسے کچھ واقف اور کشش پذیر معلوم ہوتی ہے۔ اور اُسے دیکھ کر وہ
شرم بھی محسوس کرتا ہے۔

مگر شرم کرے تو کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اور گفتگو کرے تو اعتقاد ضایع ہونے
کا خوف یا یہ بھی نہیں تو باعث تمسخر بننے کا شبہ !!

یہ سب سوچ کر اُس نے اپنا سارا وقت باہر گذارنا شروع کر دیا ہے۔

اب دوستوں کے پاس دل نہیں بہلتا ٹینس کھیلنے میں طبیعت نہیں لگتی۔
سب اور کالج ختم ہو گئے ہیں۔ سیمارات کی چیز ہے۔ اس لئے پارک میں یا غیچہ
یا دریا کے کنارے یا تواریخی آثار کو دیکھنے میں دن گذار دیتا ہے۔

اعتقاد کے شکستہ ہونے کے خوف سے اچانک وہ متفکر رہنے لگ گیا تھا۔

۵

آج پھر رنگی لال نے بلا لیا۔ جب پوچھا۔ کہاں رہتے ہو؟ گھر سے کیوں اس قدر
نفرت ہو گئی ہے؟ تو فی الفور سر جھکا کر نرمی سے بولا ـــــ صاحب! آج ایک
بات آپ سے کھلے طور پر کہتا ہوں۔ بُرا نہ منائیے گا۔ اور مجھ گنہگار کو شرمندہ بھی نہ
کیجیے گا۔

جب رنگی لال نے منظور کیا تو بولا ـــــ میں بیاہ کے معاملہ پر ان دنوں سنجیدگی
سے غور کر رہا ہوں ـــــ پھر کچھ ٹھہر کر ـــــ " اور دیکھئے آپ بیشک دل ہی
دل میں مجھے خوفناک گنہگار کہیں میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مجھے بیاہ کر لینا چاہیئے۔
اب آپ چاہیں تو مجھے گالیاں دے لیں "

"واہ اس میں گالیوں کی کونسی بات ہے۔ آخر بیس بائیس سال کے ہو گئے۔ ماں باپ کی اکیلی اولاد۔ پھر بیاہ کیوں نہ کرو۔ واہ بھئی! واہ! بیاہ تو کرنا ہی ہوگا اس گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کو ہم تو دیکھ سکتے ہیں لیکن مدھوسودن سے امید کہاں تھی؟ عجلت سے بولا ــــــ "جی ہاں! میں نے سوچا ہے۔ سارے خاندان کا جی جلانا بہتر نہیں۔ اور پھر ساری دنیا میری جان کے پیچھے پڑی ہے بیاہ کرو، بیاہ کرو۔ ایک آپ کی بات چھوڑ دی۔ آپ ــــــ

رنگی لال نے کہا ــــــ "جوں جوں عمر بڑھیگی یہ وبال بڑھیگا ہی۔"

"جی ہاں! بڑھیگا ہی۔" ــــــ مدھوسودن نے کہا ــــــ "ہاں سوال خدمت وطن کا۔ اس میں اولاد اصل میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ عورت تو نہیں۔ عورت تو روکا کیا، اگر شوہر چاہے تو مددگار بن سکتی ہے۔ ٹھیک ہے نہ؟ اور اولاد تو ہاتھ کی بات ہے ضبط تو انسان کی پہلی صفت ہے۔ اور میرا تو پچیس سال کا اعتقاد ہے۔ چار سال تو ــــــ

رنگی لال نے منہ پھیر کر چلم کا کش لگاتے ہوئے کہا ــــــ "سب ٹھیک ہے تم بیاہ کر لو۔ مٹھائی کھائے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

پھر بلیتی نہ جمی اور مدھوسودن جب باہر آیا تو پانچ منٹ تک دیوار سے کان لگائے کھڑا رہا۔ کہ رنگی لال ہنس تو نہیں رہے ہیں۔

بوا نے ــــــ جس کا پرتاو بھابی کی طرح ہے ہنس کر بتا دیا۔ کہ موسی کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی اس کی بہو بننی ممکن ہو سکتی ہے۔

اگلے دن کئی خاص واقعات پیش آئے۔ موسی اور لڑکی چلی گئی۔ بابو جی ــ

صاف کھل کر کچھ باتیں کیں۔ اور مدھوسودن نے سر تسلیم خم کر دیا۔

(۶)

بیاہ ہو گیا ہے۔ ضبط اور قسم کھانے کی دھجیاں بکھر چکی ہیں۔ ہاں صرف اعتقاد ہی باقی ہے۔ مگر پھر بھی ابھی اسی کی اُٹھین نظر آتی ہے۔ ابھی وہ اولاد کے مانع اعتقاد میں اسیر ہے۔ لیکن فرق اسقدر ہے پہلے تا حیات اولاد سے دُور رہنا اعتقاد میں داخل تھا۔ اور اب صرف چار پانچ برس ——

ضبط اولاد کی عظمت کو خوب سمجھ لیا ہے۔ اور نئی عزالہ کو خوب اچھی طرح سمجھایا بھی جا رہا ہے۔ میری شیس کی تمام کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اور سمجھ چکا ہے۔ مولنیبرین ٹیڈیبی کا معتقد بن گیا ہے۔ اور برتھ کنٹرول کی مناسب تدابیر پر عمل بھی جاری ہو گیا ہے۔

دوستوں میں خوب ڈھینگ ہانکی جاتی ہے۔ ضبط۔ تجرد اور برتھ کنٹرول پر مختصر اور بے عمل ذکر سنتا ہے۔ اور کمزور ڈرپوک اور عورت کے غلام ساتھیوں پر مخول اُڑایا جاتا ہے۔

لیکن جو سمجھدار اور تجربہ کار ہیں۔ وہ اُترے ہوئے نشہ کو دیکھتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔

زنئی لال بھی دیکھتے ہیں لیکن مسکراتے نہیں۔

لیکن ارے! یہ کیا ہو گیا۔ مہینہ گذر گیا۔ ایک ہفتہ۔ دو ہفتہ۔ لو اب تیسرا مہینہ بھی جانے لگا [illegible] برابر سرگرم کار رہتا ہے۔ مدھوسودن مہینے کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھتا ہے۔ کیا ہو گیا! سب تدبیریں۔ تمام ذرائع اور طریقے فضول ثابت ہوتے

ابھی تو چھ ماہ بھی نہیں گذرے۔

بے چین ہو گیا۔ سائنس کی کتابیں چھان ماریں۔ ڈاکٹری ویدک اور طب کی کتابیں پلٹ دیں۔ اور نسخے تلاش کئے۔

پھر ایک دن زبردستی دوا پلادی۔

(۷)

پانچ سال گذر گئے ہیں خدمت وطن کیا ہونی تھی۔ پڑ گئے روزگار میں پارٹی اور پیٹ کے چکر ہیں۔ ہاں اس قدر ضرور ہوا۔ کہ اولاد ابھی تک نہیں ہوئی واہ کیسا لاجواب نسخہ تھا۔ ایک ہی خوراک میں جھگڑا ختم۔

لیکن مدھوسودن یہ نہیں کہتا۔ وہ تو اس خوراک کو کوستا ہے۔ اُن کتابوں کو جلا ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اور برتھ کنٹرول کی کُتب کو گولی سے اُڑا دینا چاہتا ہے۔ نہ جانے کیا کیا کہا کرتا ہے۔

کبھی تنے کہ دیا بائیس برس تک عورت کے اولاد نہ ہو تو پھر ہونا ممکن نہیں۔ بس اب جی جان سے گیا۔ اگر ایک لڑکا ہو جاتے یا زیادہ سے زیادہ ایک لڑکی۔ اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں یہ بھی نہ ہو تو بات کیا رہی۔ بیاہ تو اولاد کے لئے کیا ہے۔ اندھا دھند نہیں۔

ان دلیلوں کا تو اب وقت نہیں اب تو سال کے اندر کسی نہ کسی طرح باپ بننا ہے۔ خواہ کسی طرح ہو۔ خواہ کس قدر رقم صرف ہو اور کوشش کرنی پڑے۔

خدمت وطن! ٹھہر و جی۔ وہ اسوقت کہنے کی بات تھی۔ نہیں اب تو دو سال کے اندر اندر باپ بننا ہے۔ اور خاندان کو لا اولاد ہونے سے بچانا ہے۔

نرس۔ مس۔ ڈاکٹر۔ وید۔ حکیم دو سال سے علاج معالجہ کر رہے ہیں اب نمبر آیا ہے۔ نجومی۔ رمال اور جھاڑ پھونک والے سیانے کا۔

دادی مرنے سے پہلے پر پوتا دیکھنے کو تڑپ رہی ہے۔ ماں کے پیٹ میں پوتے کے خیال سے خوراک تحلیل نہیں ہوتی۔ بیوہ بوا کے پاؤں میں دوڑتے بھاگتے آبلے پڑ گئے ہیں۔

اور خود استری اور مرد کے جی ہیں جو اپنے دلی ارادوں کی جھلک بھی ایک دوسرے تک پہنچانے میں ہچکچاتے ہیں کیسی عجیب دھڑکن اٹھتی ہے۔

مدھوسودن اب ذمہ داری سمجھنے لگ گئے ہیں۔ دوسروں کے بچوں کو پیار کرلے "لالا بلا۔ جھجک بیٹا" کہنے کا عادی ہوگیا ہے۔

اور اپنی اُس —— ہاں اُس عجلت اور جلد بازی پر نامعلوم کتنی دفعہ اپنے آپ کو سہتے رہتے ہیں۔

(۸)

لڑکا ہونا نہیں تھا۔ نہ ہوا۔ مدھوسودن اب ضعیف العمر ہوگئے ہیں لیکن انہیں اولاد کی اس قدر خواہش نہیں ہے۔ تقدیر سے تو ہزیمت نہ اٹھاتے۔ لیکن اپنے جیتے کا کیا علاج اب وہ محلہ کے کئی یتیم بچوں کو وظیفے دیتے ہیں کسی کو کتابیں کسی کو بڑے لڑکوں کو بیٹا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس سے ان کے دل کو تسکین ملتی ہے۔

ایک دن اُنہوں نے اخبار میں پڑھا۔ اُن کے ایک دوست کا لڑکا سول سروس میں آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اُن کا چہرہ مرجھا گیا۔ فی الفور ایک لڑکے نے آکر کہا —— دادا آج امتحان کا نتیجہ سنا دیا گیا۔ میں نے سب سے زیادہ نمبر لئے مدھوسودن

خوش ہو کر لڑکے کی پیٹھ ٹھونکنے لگا۔

اسی طرح ایک دن انہیں ایک دوست کا دعوتی رقعہ ملا۔ اُس کے بیٹے کی شادی تھی۔ مدھوسودن کی شکل پھر تھوڑی دیر کے لئے مرجھائی۔ ایک ٹیوسن ایک بچے کو لئے ہوئے آئی اور بولی ـــــ "اسے بازار جا کر مٹھائی لے دیجئے۔ ایک گھنٹہ سے رو رہا ہے" مدھوسودن نے مسکرا کر بچے کو گود میں لے لیا۔ اور بازار چلا گیا۔

موپساں
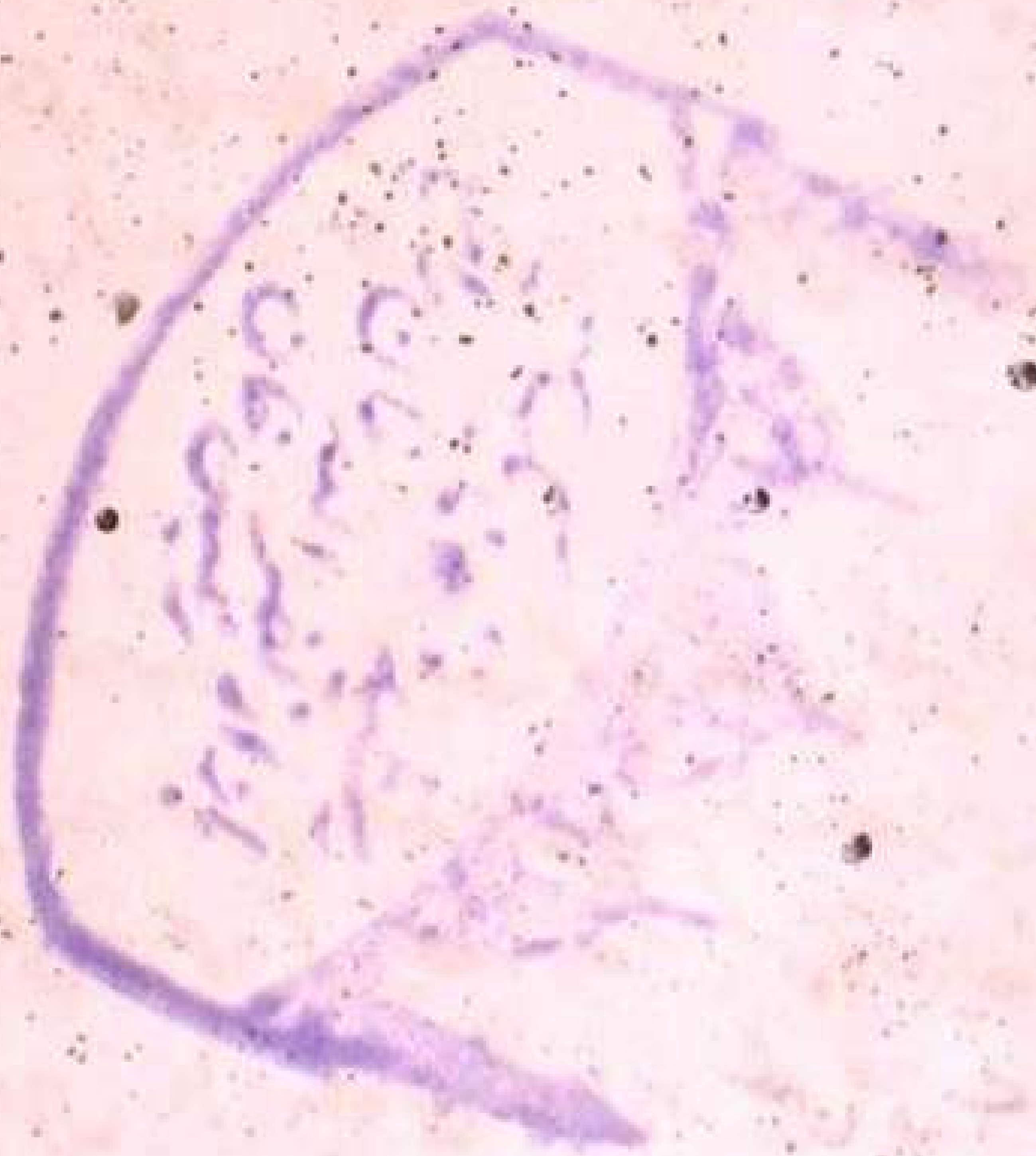
خودکشی

صبح کا وقت تھا۔ آفتابی شعاعیں رُخِ مشرق کو سُرخ کر رہی تھیں۔ سامنے دریا
آہستہ آہستہ مستانی چال سے بہہ رہا تھا۔ صبحِ صادق کے دُھندلے مگر روشن ظہور سے
اس کا مُصفّا پانی اس طرح نظر آتا تھا جسطرح پگھلی ہوئی چاندی بہتی چلی جا رہی ہے۔
دریا کے دوسرے کنارے بلند اور گنجان درختوں کی سیدھی قطار نیلگوں آسمان کے
سے لے رہی تھی۔ ہر بادل کی یہ بلند و بالا دیوار از حد سہاونی اور دلکش تھی۔

علی الصبح جب فطرت رات کی گہری نیند کو توڑ کر دنیا کو بیدار کر رہی تھی۔ اس میں
روح موجزن نظر آتی تھی۔ ہر برگ و شجر میں ایک نئی جولانی نظر آنے لگی۔ بادِ نسیم
ہر ایک جھونکے میں اور پانی کی ہر ایک لہر میں ایک نئی تازگی کارفرما تھی۔ وہ وقت
تجمل۔ کیسا [illegible]ت آفریں اور کس قدر محبت زا تھا۔

ڈاک آچکی تھی۔ میں نے ایک اخبار اُٹھایا۔ اور دریا کے کنارے پہل قدمی کے

لئے چلا گیا۔

اخبار کا پہلا صفحہ الٹتے ہی میری نظر ایک مضمون پر پڑی جس کا عنوان تھا ــــــ خودکشی کی اقسام ــــــ اس میں تحریر تھا۔ کہ اس سال آٹھ ہزار پانچ سو سے زاید اشخاص نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہے۔ ان اعداد و شمار کو پڑھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ آٹھ ہزار پانچ سو سے زاید اشخاص نے اس سال میں خودکشی کر کے اپنی زندگیوں کو تباہ کر لیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ آدمیوں کا کتنا بھاری اور خوفناک قتل عام ہے۔ زندگی سے مایوس۔ اپنے آپ سے تنگ آئے دُنیا کی مسافرت سے درماندہ یہ ہزاروں آدمی کس طرح اپنا خاتمہ کرنے پر مجبور ہوئے۔

سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگا۔ میں نے دیکھا ــــــ لوگوں کے جسموں سے خون کے فوارے بہہ رہے ہیں۔ اُن کے جبڑے پھٹ گئے ہیں۔ کھوپڑیاں پاش پاش ہو رہی ہیں۔ چھاتی کو چیر کر جگر چھلنی ہو رہے ہیں۔ سارا جسم خون سے لت پت ہے۔ اس طرح کے کتنے ہی افراد ہوٹلوں کے تنہا کمروں میں پڑے ہیں۔ انہیں اپنے زخموں کا کوئی خیال نہیں ہے۔ انہیں اگر کسی بات کا دھیان ہے۔ تو صاف ان مصائب کا جن سے تنگ آ کر وہ خودکشی پر مجبور ہوئے۔

میں نے دیکھا ایک آدمی کے ہاتھ میں چھری ہے۔ وہ آنکھ بند کرتا ہے۔ اور تیزی کے ساتھ وہ چھری اپنے پیٹ میں بھونک دیتا ہے۔ پیٹ پھٹ جاتا ہے۔ خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے۔ گلا گھٹنے لگ جاتا ہے۔ اور آدمی اُلٹے منہ گر پڑتا ہے۔

میں نے دیکھا ایک آدمی نے اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی پکڑی ہوئی ہے۔ شیشی پر سرخ لیبل لگا ہوا ہے۔ وہ تسکین سے ڈاٹ کھولتا ہے۔ اور بڑے

دھیان سے غور کرتا ہوا۔ اس شیشی کو پوری توجہ سے دیکھتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیشی کے زہر کو آنکھ بند کر کے پی جاتا ہے۔ لمحہ بھر بعد دانت کٹکٹانے لگتے ہیں۔ ہونٹ بند کر لیتا ہے جسم اکڑنے لگتا ہے۔ وہ غریب آدمی آنکھیں موند کر گر پڑتا ہے۔ اس کے منہ پر خوف کے آثار ہیں۔ یعنی وہ سوچ رہا ہے۔ کہ اور کتنی دیر تک اسطرح خوفناک مصیبت برداشت کرنی پڑے گی۔

تھوڑی دیر تک وہ آدمی اسی طرح مبہوت رہتا ہے۔ کبھی اُٹھتا ہے کبھی گرتا ہے۔ کبھی مٹھیاں بند کر لیتا ہے۔ کبھی پاؤں پٹختا ہے۔ اُس کی انتڑیاں جل رہی ہیں ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ بند بند اُکھڑ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد موت آتی ہے۔ اور اُس کے دکھوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتی ہے۔

میں نے دیکھا شام کا وقت ہے۔ چند لوگ ہاتھوں میں رسیاں لیکر چکر لگا رہے ہیں۔ وہ اس امر کی تلاش میں ہیں۔ کہ کوئی مناسب تنہا مقام مل جائے۔ جہاں وہ اپنے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال سکیں اور ہمیشہ کے لئے۔ مصائب کے ہاتھوں سے نجات پا جائیں۔ بالآخر دیوار کی کسی کھونٹی یا چھت کی کسی کڑی اور درخت کی کسی شاخ کے علاوہ کسی خالی شہتیری پر رسّی باندھ کر اپنے آپ کو وہ معلق کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی حیات چند روزہ کا تماشہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور اُن کا زندہ جسم لمحہ بھر میں لاش بن کر لٹکنے لگ جاتا ہے۔

میں نے دیکھا ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے۔ جو چاروں طرف سے بند ہے درمیان میں کوئلوں سے دھدکتی ہوئی انگیٹھی جل رہی ہے۔ قریب ہی ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ایک ماں اپنے بچوں کے ساتھ ہمیشہ کی نیند سو رہی ہے یا کوئی بھوکا

ننگا بوڑھا آدمی چیتھڑے لپیٹے ہوئے کبھی نہ ٹوٹنے والے خواب راحت سے لذت یاب ہو رہا ہے۔ یا کوئی دوشیزہ شباب کی آگ میں جلتی ہوئی ہمیشہ کے لیئے اپنے جگر کو ٹھنڈک کر رہی ہے۔ کیسا دردناک نظارہ ہے۔ ان سب کی موت دم گھٹنے سے ہوتی ہے۔ اور وہ کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی زہریلے دھوئیں کے ساتھ ابھی تک ان کے کمرہ میں اسی طرح دھدھک کر جل رہی ہے۔

میں نے دیکھا۔ رات کا وقت ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں بدمست ہیں ہر چہار سو خاموشی کا عالم ہے۔ کتنی گہری اور تاریک رات ہے۔ دریا کا لاتعداد پانی پوری تیزی سے بہہ رہا ہے۔ پل پر ایک آدمی نہائیت خاموشی سے آتا ہے۔ اور کنارے پر کھڑا ہو کر نیچے جھانکنے لگ جاتا ہے۔ کتنا گہرا پانی ہے۔ کیسی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ پل کے کھمبوں سے ٹکرا کر پانی کتنے جوش سے اچھل رہا ہے۔ اس بے پناہ اور خوفناک پانی کی رفتار کو دیکھ کر یکلخت ساعت وہ ذرا ڈر جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ وہ واپس ہونے لگتا ہے۔ لیکن نہیں ——— اسے واپس نہیں جانا۔ دور سے گھڑیال کی ٹن ٹن کی آواز آئی ہے ——— اس کے لمحہ بھر بعد دریا کے پل کے نیچے دھڑم کی آواز ہوتی ہے۔ ایک دو چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ تھوڑا سا ہاتھ پاؤں مارنے کا شور سنائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بالکل سکون طاری ہو جاتا ہے۔ وہ آدمی دریا میں کود پڑا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تمام مصیبتوں کا ہمیشہ کے لیئے خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اوہ! یہ لوگ کتنے بد قسمت ہیں۔ ان کی موت کس قدر مصیبت بیز ہے۔ ان کی زندگی تو موت سے بھی زیادہ دکھ بھری ہے۔ ان کم بختوں کے متعلق سوچتے سوچتے

میرا جی درد سے لبریز ہو گیا ہے۔ اُن کی موت پر غور کرتے ہوتے موت کی بھیانک تصویر مجسم طور پر سامنے رقص کرتی نظر آتی ہے۔

ان سیاہ بختوں کی زندگی کسقدر مصیبت سے اٹی ہوئی ہے۔ یہ مصیبتوں کے مارے کمزور لوگ کس طرح قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ بات بات پر ذلیل ہوتے ہیں۔ اس دُنیا میں انہیں ذرا بھی راحت نہیں ہے۔ مگر انہیں یقین ہے کہ دوسرے عالم میں اُن کی ضرور سُنی جائیگی۔ وہ خدا جو اس عالم میں ہمارے اُوپر اسقدر طیش زدہ تھا۔ عالم بالا میں ضرور رحم کریگا۔

اری خود کشی! تم کس قدر عجیب شئے ہو۔ تُو تو بے آسروں کا آسرا ہے بے طاقتوں کی طاقت ہے۔ بے یار و مددگار کی رفیق ہے۔ جو لوگ ہمیشہ کے لئے مایوس ہو چکے ہیں۔ اُن کی واحد اُمید تمہارے ساتھ وابستہ ہے جو بزرگ ہو چکنے سے ناطاقت اور بے یار و مددگار ہیں۔ اُن کا تم ہی سہارا ہو۔ جن کا اس دُنیا میں کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ جن کو اپنی قسمت پر قطعی ناز نہیں ہے۔ اُن کو تم ہی نجات بخشنے والی ہو۔ بلاشبہ تو ایک دروازہ ہے جسکو کھولکر آدمی جب چاہے۔ اس دُنیا کے سمندر سے پار ہو سکتا ہے۔ فطرت اور قدرت نے ہم پر بڑا رحم کیا ہے۔ کم از کم ہمیں اُس نے آزاد تو بنایا ہے۔ انسان اس دُنیا میں اسیر تو نہیں ہیں۔ وہ بالکل آزاد ہیں۔ جب چاہیں اس دُنیا کو چھوڑ کر باہر جا سکتے ہیں۔ بدقسمتوں مصیبت زدوں۔ مایوسوں کے لئے قدرت کی آغوش ہر وقت وا رہتی ہے۔

آدمی شنکر کس بات کی ہے؟ آگے بڑھ سکتے ہو تو آگے بڑھے چلو۔ لیکن اگر تمہارا راستہ خار دار جنگلوں سے اٹا پڑا ہے۔ تو خوف کیوں کھاتے ہو؟ تمہارے

دیکھیے یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس دروازہ سے جب بھی تم چاہو گزر سکتے ہو۔ اس دروازہ کو خدا اور اُس کے فرشتے بھی بند نہیں کر سکتے۔

کافی دیر تک میں اسی طرح ان لوگوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کتنے لاتعداد لوگ ہیں۔ آٹھ ہزار پانچسو سے بھی زیادہ۔ صرف ایک ہی سال میں اس قدر لوگ اپنی زندگی کا اس طرح خاتمہ کر چکے ہیں۔ تھوڑی دیر تک اس معاملہ پر سوچتے سوچتے مجھے احساس ہونے لگا۔ کہ خودکشی کرنے والے یہ سب لوگ میرے سامنے آ کھڑے ہیں ٹھیک اسی انداز سے جس طرح انتخاب کے وقت ووٹر لوگ پولنگ سٹیشن پر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ خودکشی کرنے والے یہ سب لوگ مل کر سماج کے سامنے ایک مطالبہ پیش کر رہے ہیں۔ ایک استدعا کر رہے ہیں۔ اور ایک اپیل کر رہے ہیں۔ ابھی سماج اُنکی درخواست پر غور کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ دنیا ابھی ان کی پیچیدگی کو سمجھ بھی نہیں پائی۔ اُن کا مطالبہ کیا ہے؟ یہ سماج سے کہہ رہے ہیں ـــــ نیک لوگو! کم از کم ہمیں تسکین سے مرنے تو دو۔ جب تک ہم زندہ رہے دُکھ اُٹھاتے رہے لیکن اب موت کے وقت تو مصیبتوں سے بچنے دو۔ زندگی میں تم نے ہماری ذرا بھی مدد نہیں کی۔ مگر اب مرنے میں تو ذرا بھر مدد کر دو۔ دیکھو ہماری تعداد کم نہیں ہے۔ ہم ہزاروں ہیں اور ہماری تعداد متواتر بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ زمانہ آزادی کا ہے۔ عوام کی طاقت کا ہے۔ سب لوگ حسب خواہش اعمال بجا لاتے ہیں۔ اپنی رائے کا حسب خواہش اظہار کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ زندگی سے تنگ آ کر مرنا چاہتے ہیں۔ انہیں موت کے وقت تو باعزت طور پر آزادی کے مرنے دو۔ اس وقت تو ہم پر رحم کرو۔

میں خواب دیکھنے لگا۔ میری تخیل آرائی مجھے اُٹھا کر عالم بالا میں لے گئی۔ خیال کی پرواز سے میں کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔

مجھے احساس ہوا کہ میں کسی بڑے شہر میں گلگشت پذیر ہوں۔ شاید یہ شہر پیرس تھا۔ لیکن آجکل کا پیرس نہیں۔ کس عہد کا یہ میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا۔ میں پیرس کے بازاروں اور گلیوں میں چکر کاٹتا ہوا۔ وہاں کی سربفلک عمارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ کہیں رقص گاہیں اور محفل خانے۔ کہیں تھیٹر تھے۔ اور کہیں سنیما اور ہوٹلوں کی بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے جب میں ایک بڑے چوک میں پہنچا تو سامنے ایک بڑی فراخ اور شاندار عمارت تھی۔ جو دیکھنے میں بڑی دلکش اور جاذب نظر تھی۔ دیکھنے والے فطری طور پر اس سے کشش پاتے تھے۔

جس وقت میں اس کے سامنے پہنچا تو الفاظ ذیل کو بڑے موٹے اور چمکدار حروف میں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"مجلس حسنب خواہش خودکشی"

جب آدمی خواب دیکھنے لگتا ہے۔ اور وہ بھی خواب میں نہیں بلکہ بیداری میں اس وقت اُس کے سامنے کتنے عجیب و غریب نظارے آتے ہیں۔ اس وقت کسی بات پر حیرانی نہیں ہوتی۔ کوئی شے ناممکن محسوس نہیں ہوتی۔ اسوقت شعور کی گرفت نرم ہو جاتی ہے۔ قوت تخیلا نا معلوم کہاں کہاں پرواز کرنے لگتی ہے۔ ممکن ناممکن اور اچھے بُرے کی بھاری تمیز جاتی رہتی ہے۔

میں اُس مکان کے پاس چلا گیا۔ سامنے کچھ سنتری بیٹھے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کسی کلب کے سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک جانے پر ان میں سے ایک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور گویا ہوا ——

حضور! آپ کیا چاہتے ہیں؟

میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کونسا مقام ہے؟

"بس یہی کچھ اور کچھ نہیں؟

"حضور! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اس کلب کے ناظم کے پاس لیجاؤں؟

مجھے کسی قدر جھجک سی محسوس ہوئی۔ اور دریافت کیا ——

"کہیں اُن کے کام میں رخنہ تو نہیں پڑیگا؟

"اوہ! بالکل نہیں حضور! ناظم صاحب کا یہی کام ہے۔ جو لوگ کچھ دریافت کرنا چاہیں

انہیں سب کچھ بتانے کے لیئے وہ ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔

"بہت بہتر میں آپ کے ہمراہ چلتا ہوں۔

"چپراسی مجھے کمروں سے اندر لیجا رہا تھا۔ راستہ میں مختلف کمروں میں چند بوڑھے

گپ بازی میں محو تھے۔ انجام کار میں ایک بڑے خوشنما کمرہ میں پہنچا جس کا ساز و

سامان کافی کشش پذیر تھا۔ ایک موٹا اور ٹھگنے کی توند والا نوجوان اندر بیٹھا سگار کا

دھواں اڑا رہا تھا۔ اور ایک چٹھی لکھنے میں مصروف تھا۔

وہ میرے آنے پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کا آداب بجا لایا۔ اور

کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چپراسی کے چلے جانے پر ہماری اس طرح گفتگو ہوئی۔

اس نے دریافت کیا —— میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

میں نے کہا —— اُمید ہے آپ مجھے اس طرح تکلیف [illegible] پر معاف فرمائیں

گے۔ میں نے پہلے کبھی اس ادارہ کو نہیں دیکھا۔ باہر عمارت پر جو الفاظ نقش پذیر ہیں

انہیں پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اور خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس کے متعلق واقفیت پیدا کروں۔

میری بات سن کر وہ مسکرانے لگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ مدھم آواز میں اس نے میرے سوال کا جواب ان الفاظ میں دینا شروع کیا۔ اس وقت اسکی صورت سے صبر کی جھلک نظر آتی تھی۔

"جناب من! جو لوگ مرنا چاہتے ہیں۔ یہاں ان کی تسکین و اہتمام سے آرزو پوری کیجاتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس سے انہیں راحت ملتی ہے لیکن کم از کم کوئی خاص تکلیف نہیں ملتی"۔

ناظم کی گفتگو سن کر مجھے صبر نہ آیا۔ ان کی بات بالکل واضح اور سیدھی سادھی تھی۔ لیکن مجھے حیرت تو یہ تھی۔ کہ ہماری اس کائنات پر جہاں کے رہنے والے اس قدر خود غرض ہیں۔ اور جہاں لوگ حقیقی آزادی سے دور بھاگتے ہیں —— اس قسم کا ادارہ کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ ایسی کلب تو ان لوگوں میں قائم ہو سکتی ہے جو ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہوں۔ جو بڑھ کر غلامی سے سربلند ہو چکے ہوں اور جو اپنی ہر ایک قسم کی اڑچنوں کو توڑ کر کامل طور پر آزاد ہو گئے ہوں۔

میں نے پھر دریافت کیا —— "یہ ادارہ کس طرح قائم ہوا؟"

جواب ملا —— جناب والا ۱۹۸۸ء کی نمائش سے قبل خودکشی کی تعداد اس کثرت سے بڑھ رہی تھی۔ کہ اس کا علاج کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ جہاں دیکھئے لوگ اپنے آپ کو تباہ کر رہے تھے۔ بازاروں، گلیوں، تھیٹروں اور آرام گاہوں وغیرہ میں اور تو اور ریل کے ڈبوں تک میں بھی لوگ اپنے آپ کو قتل کرتے

ہوتے پائے گئے۔ دوسرے لوگوں پر اس سے بُرا بُرا اثر پڑتا تھا۔ وہ خودکشی کے ان خوفناک نظاروں سے بیچین ہوجاتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بچوں کے دِلوں پر ان کا اثر اور بھی بُرا ہوتا تھا۔ خودکشی کرنے والوں کی تقلید ترقی پذیر تھی۔ ان وجوہات سے ضروری ہوگیا۔ کہ خودکشی کے لئے ایک مقام مقرر کر دیا جاتے۔ اور سبھا قائم کیجائے۔"

"خودکشی کی عادت اس قدر کیوں ترقی پذیر ہوگئی تھی؟"

"مجھے اس کا پُورا پورا علم نہیں ہے۔ لیکن ہاں میں اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ دُنیا پُرانی ہوگئی ہے۔ کوئی آدمی اپنے حالات پر قانع نہیں۔ لوگ جن حالات میں ہیں اُنہیں دُرست نہیں سمجھتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ قدم قدم پر انہیں محسُوس ہوتا ہے۔ کہ دُوسرے لوگ ہمیں ٹھگ رہے ہیں ہمیں ٹھگنے۔ دھوکہ دینے اور لُوٹنے کی بذات خُود کوشش کر رہے ہیں۔ اور تو اور خُدا بھی ہمیں ٹھگتا۔ دھوکہ دیتا ہے۔ بولتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے۔ جس طرح کسی سیاسی جماعت کا نمائندہ منتخب ہولے کے بعد اپنے ووٹروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اسی طرح خدا دُنیا کو متواتر دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ صرف اسی قدر مسلسل جس سے آئندہ انتخاب میں نمائندہ تو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر خدا کو کون بدلے؟ یہ دُنیا بھر کا مالک بنا ہوا خُدا اپنی رعایا پر جو اسقدر مظالم بپا کرتا ہے۔ لوگوں کو اسقدر خوفناک تکلیفیں دیتا ہے۔ اس کا آدمی کے پاس کیا علاج ہے؟ —— کچھ بھی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ مصیبت زدہ لوگ مایوس ہوجاتے ہیں۔ آخر کار اپنی تکلیفات کا خاتمہ بالخیر کرنے کے لئے اس دُنیا سے کُوچ کرنے میں ہی وہ اپنی بھلائی تصور کرتے ہیں۔ یہ دُنیا اُنہیں ازحد پست اور بھدی معلوم ہوتی ہے۔ اس دنیا میں رہنا انہیں

کیسی قیمت پر مفید نظر نہیں آتا۔"
"کیا دراصل یہی معاملہ ہے؟"
"ہاں! میں کوئی شکائیت بیان نہیں کر رہا ہوں"۔
"کیا آپ مجھے یہ بتانے کی نوازش کریں گے۔ کہ یہ ادارہ اپنا کام کسطرح چلاتا ہے"
"بڑی خوشی سے۔ ہر ایک آدمی اس ادارہ کا ممبر بن سکتا ہے۔ یہ ایک کلب ہے"
"ہیں! کیا یہ کلب ہے؟"
"جی ہاں حضور! یہ ایک کلب ہے۔ اسکے قائم کرنے والے ملک کے بہت بڑے مدبر آدمی ہیں، ملک کے کئی سنجیدہ اور دانا لوگوں نے اسے قائم کیا ہے۔
دل کھول کر قہقہہ زن ہو کر اُس نے پھر کہا ——— میں سوگند کھا کر کہتا ہوں۔
کہ لوگ اس کلب کو یہاں پسند بھی خوب کرتے ہیں"۔
"کیا کہا ——— یہاں پر؟"
"جی ہاں یہاں پر"۔
"آپ مجھے کافی حیرت میں ڈال رہے ہیں"۔
"بیشک یہاں اسے کافی پسند کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسکے ممبران کو موت کا کوئی خوف نہیں رہتا۔ وہ موت کے واقف ہو جاتے ہیں۔
"لیکن کیا وہ لوگ جو خودکشی نہیں کرتے اس ادارہ کے ممبر بن سکتے ہیں؟"
"ہاں اس کلب کا ممبر بننے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ خودکشی کرنے کا قرار کیا جائے"
"یہ کیا بات ہے؟"

"میں واضح طور پر سمجھاتا ہوں۔ جس وقت خود کشی کافی زوروں پر تھی اور اسکے حیرت انگیز نظائر سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ تب اس ضرورت کا احساس ہوا کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو خود کشی کرنے والوں کی معاونت کرے۔ یعنی یہ ادارہ عوام کی بہتری کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کا فرض صرف یہی کچھ ہے۔ کہ زندگی سے مایوس ہو کر جن لوگوں نے خود کشی کا فیصلہ کرلیا ہے انہیں اپنی خواہش کی تکمیل میں مدد دی جائے۔ تاکہ وہ کسی تکلیف کے بغیر اپنی دلی مراد کو پورا کر سکیں"

"اس قسم کے ادارہ کی اجازت کس نے دی ہے"

"کمانڈر انچیف بولنیئرے ان دنوں پریذیڈنٹ تھے۔ وہ کسی بات پر انکار نہیں کرتے تھے۔ انہیں انکار کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ کمانڈر انچیف بولنیئرے نے اپنے محدود زمانہ حکومت میں جو بہترین کام کئے ہیں انہیں سے اس ادارہ کا قیام بھی ایک ہے۔ مہتم بالشان کام ہے۔ فرانس میں جو دور اندیش۔ صاحب اقتدار اور عقل و تمیز سے ممیز لوگ تھے۔ انہوں نے ملکر غور کیا۔ کہ پیرس کے عین مرکز میں یہ ادارہ قائم کرنا چاہئے یہ ادارہ موت پر فتح پانے والوں کے لئے ایک عجیب درگاہ ہوگا۔ پہلے پہل لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی آدمی اس کے قریب آنے تک کا حوصلہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وقت گذرتا گیا۔ لوگوں کی رائے بھی متبدل ہوتی چلی گئی۔ اس ادارہ کا افتتاح بڑے شاندار پیمانہ پر کیا گیا۔ فرانس کے سب بڑے بڑے لوگ اس میں شامل ہوئے۔ خوب دھوم دھام رہی۔ پیرس کے تو تمام سارے لوگ اس افتتاحی رسم میں شریک ہوئے تھے"

اس ادارہ کا افتتاح بڑے تزک و احتشام سے ہوا تھا؟ کیسا عجیب مذاق ہے"

"مذاق بالکل نہیں - موت کو تم کیوں اسقدر خوفناک خیال کرتے ہو — دیکھو! ہم نے موت کو کسقدر سادہ کشش پذیر بنا ڈالا ہے۔ ہمارے ادارہ میں موت کا درخت جو اچھی طرح بارآور ہو رہا ہے۔ اس کی مہک اب دُور دُور تک پہنچ رہی ہے آدمی موت سے صرف اس لیئے ڈرتا ہے۔ کیونکہ دوسروں سے اُس نے یہی سیکھا ہے۔ درحقیقت اگر دیکھا جائے تو اسمیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

"یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے۔ کہ لوگ تماشہ کے لیئے اکٹھے ہوں۔ مگر کیا یہاں پر کوئی ——— کے لیے کبھی آیا ہے؟"

"شروع میں تو کوئی نہیں آیا۔ کیونکہ پہلے تو لوگوں کو یقین نہیں آیا تھا"

"مگر اس کے بعد"

"لوگ آنے لگے!"

"کافی تعداد میں"

"بڑی کافی تعداد میں۔ ایک ایک دن میں چالیس چالیس سے بھی بڑھ کر یہ حالت ہو گئی ہے کہ دریا کے سامنے میں کوئی آدمی ڈوبتا ہوا بھی نہیں پایا گیا!"

"پہلے پہل کس آدمی نے اپنے آپ کو پیش کیا تھا؟"

"کلب کے ایک ممبر نے ہی؟"

"کیا وہ آدمی خدا کا قایل تھا؟"

"میرا خیال ہے۔ کہ نہیں مانتا تھا۔ وہ ایک کم بخت آدمی تھا۔ جو تین ماہ سے لگاتار قمار بازی میں ہارتا جا رہا تھا"

"سچ کہا؟"

"ہاں دُوسرا آدمی ایک انگریز تھا۔ وہ بڑا خبطی تھا۔ اس کے بعد اخباروں میں ہماری دُھوم مچ گئی۔ ہم نے عوام میں اپنے طریقوں کا خوب پراپیگنڈہ کیا۔ ہم نے لوگوں کو بتایا کہ موت کے کافی سیدھے سادھے اور آسان طریقے ہیں لوگ اس پر ہماری کلب کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگ گئے۔ مگر جو لوگ ہمارے ادارہ سے فائدہ اُٹھانے آتے ہیں۔ اُن میں اب بھی ادنےٰ درجہ کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔"

"آپ کے طریقے کون کونسے ہیں؟"

"کیا آپ میرے ہمراہ ادارہ کو دیکھنے کے لئے چلیں گے؟ آپ کو دکھاتے ہوئے میں سب باتیں نہایت باوضاحت طور پر بتاؤنگا؟"

"بہت خوب چلیئے۔"

اُس نے اپنی ٹوپی اُٹھالی اور دروازہ کھولکر میرے ہمراہ باہر چل پڑا۔ پہلے ہم ایک کمرہ میں گئے۔ جسمیں کافی لوگ قماربازی میں مصروف تھے۔ خوب ہنسی مذاق چل رہا تھا۔ یہی حالت دوسرے کمرہ میں تھی۔ سب جگہ عیش وطرب راگ و رنگ۔ کھیل کود ہنسی مذاق نظر آتے تھے۔ میں نے ایسی کلبیں بہت کم دیکھی تھیں۔ جن میں اتنی مسرت بظاہر دیکھنے میں آئے۔

مجھے متحیر دیکھ کر ناظم نے کہنا شروع کیا۔

"اس ادارہ کے بنتے لوگوں میں غیر معمولی حوصلہ پایا جاتا ہے۔ دُنیا بھر کے مہذب افراد اس کے ممبر ہیں۔ وجہ یہ ہے۔ کہ یہاں موت جیسی خوفناک خیال کی جانے والی شئے کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ یہاں آکر ہر ایک کو خوش ہونا پڑتا ہے

اگر یہاں آکر بھی کوئی خوش نہیں ہوگا۔ تو یہی سمجھا جائیگا۔ کہ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آکر لوگ جی بھر کر مخول کرتے ہیں ہنستے کھیلتے اور موج اڑاتے ہیں۔ پیرس میں آجکل اسی ادارہ کی طوطی بولتی ہے۔ سب سے زیادہ بھیڑ یہاں ہی رہتی ہے۔ ان دنوں عورتیں بھی کوشش کر رہی ہیں کہ اپنے لئے اسکی ایک الگ شاخ کھولیں"۔

"باوجود ان سب باتوں کے یہاں لوگ اتنی بڑی تعداد میں خودکشی کے لئے آتے ہیں؟"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہاں روزانہ چالیس سے لیکر پچاس تک لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کے لوگ تو کم آتے ہیں مگر غریب اور مصیبت زدہ لوگ یہاں روزانہ کافی تعداد میں آتے ہیں۔ اور اوسط درجہ کے لوگوں کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے"۔

"ہاں! یہ تو بتائیے یہ خودکشی ——— کس طرح کی جاتی ہے۔

"نبض کی رفتار بند کر کے"!

"آپکا سامان کہاں ہے"؟

"ہم نے بذات خود ایک گیس ایجاد کی ہے۔ اسے ہم نے رجسٹرڈ کرایا ہوا ہے عمارت کی دوسری طرف عوام کے لئے دروازہ موجود ہے۔ اس میں سے کوئی بھی آدمی داخل ہو کر جب دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ تو ہمارا آدمی فی الفور وہاں پہنچ جاتا ہے۔ اور اُسے ہر قسم کی مدد بہم پہنچاتا ہے۔ اُسے تمام امور سے اچھی طرح آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ پھر جیسا وہ چاہتا ہے کر دیا جاتا ہے"۔

"آپ کو روپیہ کہاں سے ملتا ہے"؟

"ہمارے پاس روپیہ کی کیا کمی ہے؟ ہماری کلب کی ممبری کے لئے جو چندہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ کافی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارہ کو دان بھی کافی ملتا ہے۔ چندہ دینے

والوں کے نام اخبارات میں شائع کرائے جاتے ہیں۔ ایک بات اور ہے۔ اگر کوئی امیر آدمی خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ تو اُس سے ایک ہزار روپیہ فیس لی جاتی ہے۔ مگر غرباء سے کوئی فیس نہیں لی جاتی "

"آپ کسطرح شناخت کرتے ہیں کہ کون امیر اور کون غریب ہے؟"

"اوہ! یہ پہچاننا کوئی مشکل نہیں ہے، ویسے ہم نے یہ اعلان کیا ہوا ہے کہ غریب لوگ اپنے تھانے سے غربت کا ایک سرٹیفکیٹ لایا کریں۔ آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے کہ غریبوں کے لئے آمد کا دروازہ کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہے۔ اس ادارہ کے اُس حصہ کو میں نے بھی صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ اوہ! کتنا پُر درد نظارہ تھا۔ میری ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اس طرف پھر جانے کا نام بھی لوں۔ عمارت بھی نہایت پختہ اور شاندار ہے۔ مگر جو لوگ وہاں آتے ہیں، کیا تم اس حالت کا تصور بھی کر سکتے ہو، کتنا خوفناک اور دردناک منظر ہوتا ہے بوڑھے آدمی پھٹے پرانے چیتھڑوں میں لپٹے چلے آتے ہیں۔ بھوکے ننگے لوگ جنہیں ہفتوں سے روٹی کا ٹکڑا بھی نصیب نہیں ہوا۔ غریب بھکاری جو اپنی پیدائش کے روز سے ہی بدتر حالت میں گلیوں کے کونوں میں پڑے کوڑا کرکٹ سے روٹی کے ٹکڑے تلاش کرتے ہوئے آتشِ شکم کو تسکین دیتے ہیں۔ بیماری کی مصیبت سے کراہتی ہوئی عورتیں اور کئی بیسیوں قسم کے سیاہ بخت لوگ جن کے لئے یہ زندگی موج کا ذریعہ نہیں بلکہ گلے کی پھانسی کی مانند ہے۔ آتے ہیں۔ اور ہمارے پاس خودکشی کے لئے مستدعی ہوتے ہیں میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا ہے۔ اس کی عمر ستاسی برس سے اوپر تھی۔ اس کے بچے اور پوتے سب موت کے مُنہ میں جا چکے تھے۔ وہ چھ ماہ سے دربدر بھٹک رہی تھی۔ اُس کو دیکھ کر میری طبیعت گھبرانے لگی۔ وہ تنہا کیا ـــــ ویسے

ہی اور اس سے بھی کافی زیادہ مصیبت اُٹھاتے ہوئے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے دُکھوں سے چھٹکارا پانے کی اُمید پر ہمارے ادارہ سے مدد حاصل کرتے ہیں۔ کافی لوگ تو کچھ پوچھتے تک نہیں ہیں۔ وہ صرف یہی دریافت کرتے ہیں ــــــــــ

"وہ کہاں ہے؟" ہم انہیں خاموشی سے وہاں لے جاتے ہیں اور لمحہ بھر میں سب کام ختم کر دیتے ہیں۔

دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے آہستہ سے دریافت کیا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"چلو وہاں"

اس نے ایک دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہوتے ہوئے کہا ــــــــــ

"اندر آؤ! یہ کمرہ خاص طور پر بنایا گیا ہے۔ اس کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے اس میں صرف گیارہ افراد کی زندگی کو جُرعہ فنا نوش کرایا گیا۔

"تم اسے زندگی کا تماشہ ختم کرنے والا کہتے ہو؟

"جی ہاں اچھا اندر آئیے!"

مجھے جھجک آرہی تھی۔ بالآخر میں اندر چلا گیا۔ اندر سے یہ کمرہ کافی خوبصورت تھا پُرکشش اور چاروں طرف رنگ برنگے پردے لٹک رہے تھے۔ طرح طرح کے پھولوں سے کمرہ سجایا گیا تھا۔ چاروں طرف سے خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ میزوں پر کتابیں سگار اور شطرنج وغیرہ کے سامان پڑے تھے۔

ان تمام اشیا کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مجھے متحیر دیکھ کر ناظم کہنے لگا۔

"لوگ یہاں گپ شپ کے لئے بھی آتے ہیں!"

میں نے اُس سے ایک سوال دریافت کیا۔"

اُس نے بھی زبان بے زبانی سے اس طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں ایک آرام کرسی پڑی تھی جس پر سفید خوبصورت مخملی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کرسی کے پاؤں کے قریب پھولوں کے گلدستے رکھے تھے۔ جن سے حنائی مہک اڑ رہی تھی۔

"ناظم نے آہستہ سے کہا ——" پھول اور خوشبو میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ جسے جو پھول اور مہک پسند ہو۔ وہی لائی جاتی ہے۔ ہماری گیس میں یہ ایک خاص صفت ہے۔ کیا آپ بھی لمحہ بھر کے لئے اس گیس کو سونگھنے کی تکلیف گوارا کریں گے؟"

"نہیں مجھے معاف کیجئے ابھی نہیں" —— میں نے جوابدیا۔

میری بات سن کر ناظم مسکرانے لگا۔ اُس نے کہا ——

"جناب من! ڈرتے کیوں ہو؟ اس میں ڈرنے کا کوئی امکان نہیں ہے میں خود کئی بار اس گیس کا مزا اڑا چکا ہوں۔"

مجھے خیال آیا کہ میں کہیں ڈرپوک خیال نہ کیا جاؤں۔ جواب دیا ——

"بہت اچھا میں تیار ہوں۔"

"تو ذرا مہربانی کر کے اس آرام کرسی پر بیٹھ جائیے۔"

کرسی پر بیٹھتے ہی مجھے قدرے گھبراہٹ ہوئی۔ مگر آخرکار میں بیٹھ ہی گیا فی الفور حنا کی مہک سے میرا سارا جسم عطر آگیں ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو بھول جانے لگا۔ خود فراموشی کے جذبات مجھ پر طاری ہونے لگے۔ مجھے ایک قسم کی پرجوش مستی محسوس ہوتی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے مجھ پر سحر پھونک دیا ہے۔ میں بالکل بے حس و حرکت ہو گیا اسی اثنا میں کسی نے بازو پکڑ کر مجھے زور سے جھنجوڑا۔

بیدار ہو کر میں نے دیکھا۔ کہ ناظم کھڑا ہوا مُسکرا کر کہہ رہا ہے ــــــ
" جناب والا! آپ تو بڑے جلد قابو میں آگئے "!

〰〰〰〰〰〰

اسی دوران میں کسی آدمی نے چلا کر مخاطب ہوتے ہوئے کہا ــــــ
" حضور انور سلام! آپ کی طبیعت اچھی تو ہے "؟
یہ آواز اصلی آدمی کی آواز تھی۔ خواب کی نہیں۔ میرا خواب ٹوٹ گیا۔
میں نے دیکھا ــــــ سامنے سائین بہہ رہا ہے۔ آفتاب اسوقت سر بلند ہو کر تابش دینے لگ گیا ہے۔ دوسری طرف راستہ پر پولیس کا ایک سپاہی چلا آ رہا ہے۔
میں نے اس آدمی کو جواب دیا ــــــ
" کہیے کیا حال ہے؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ "
" مورلین کے قریب دریائے سائین سے ایک لاش ملی ہے۔ کسی آدمی نے دریا میں ڈوب کر خود کشی کر لی ہے۔ میں اسکی رپورٹ تھانہ میں دینے کیلئے جا رہا ہوں "!

〰〰〰〰〰〰

موپساں

واپسی

صبح صادق کا سہانا وقت تھا۔ سمندر کی لہریں ساحل کیساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں
بادلوں کے سفیدی مائل ٹکڑے نیلگوں آسمان پر چل رہے تھے۔ سمندر سے وابستہ گھاٹی
میں آباد گاؤں آفتابی کرنوں سے سربلند نظر آ رہا تھا۔

گاؤں کیطرف جانیوالی سڑک کے قریب ایک چھوٹا سا مکان تھا جسمیں لیبس اور اُس
کی عورت مارٹن رہتے تھے۔ مکان کیا ہے؟ ــــــ ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس کی
دیواریں کچی اور چھت پھوس کی بنی ہوئی تھیں۔ گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی باغیچی میں گوبھی
اور پیاز لگے ہوئے تھے۔

لیبس مچھلیوں کے شکار کے لئے سمندر کو گیا ہوا تھا۔ اور اس کی زوجہ مکان میں بیٹھی
ہوئی جال کی مرمت کر رہی تھی۔ چودہ سال کی ایک لڑکی دروازے کے آگے بیٹھ کر کپڑا سی رہی
تھی۔ کپڑا پھٹ کر چیتھڑا ہو گیا تھا۔ پہلے بھی وہ کئی جگہ سے سلا ہوا تھا۔ مارٹن اس کی کانٹ
چھانٹ کر کے کام کے لائق بنا رہی تھی۔ ایک اور دوشیزہ ایک چھوٹے سے بچے کو گ

میں لیکر سُلانے کی کوشش میں منہمک تھی۔ زمین پر بیٹھے ہوئے وہ بچے مٹی کھود رہے تھے۔ اور ایک دوسرے پر مٹی اچھالتے ہوئے کھیلنے میں مست تھے۔

سناٹے کا عالم تھا۔ صرف چھوٹے بچہ کے چلانے کی آواز ہی کبھی کبھی سنائی دیتی تھی اسی اثنا میں دروازہ کے قریب بیٹھی ہوئی۔ لڑکی نے اچانک چلا کر کہا ـــــ

" ماں!

" کیا ہے بیٹی؟

" وہ پھر آگیا ہے کیا؟ "

اس مکان کے رہنے والے آج صبح سے کافی پریشان تھے۔ ایک پریشان حال بوڑھا کافی دیر سے مکان کے اردگرد چکر لگا رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھکاری سا معلوم ہوتا تھا صبح کے وقت جب اس گھر کے افراد لیبس کو ساحل سمندر تک پہنچانے گئے تھے۔ تو بھی وہ مکان کے سامنے والے اسی گڑھے میں بیٹھا تھا۔ جب وہ سمندر سے واپس آئے تو بھی وہ اسی طرح بیٹھا ہوا۔ اس مکان کیطرف گھور رہا تھا۔ وہ کافی بیمار۔ تھکا ماندہ اور غریب معلوم ہوتا تھا گھنٹہ بھر وہ اسی طرح خاموش رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس گھر کے لوگ اُسے بدمعاش خیال کر رہے ہیں۔ تو وہ چپ چاپ اُٹھ کر لنگڑاتے ہوئے کہیں چلا گیا۔ وہ دیر تک اوجھل نہ رہ سکا تھوڑی دیر بعد وہ پھر لڑکھڑاتا ہوا واپس آگیا۔ اور مکان کے سامنے والے گڑھے سے قدرے دور جا کر بیٹھ گیا۔

اُسے پھر واپس آیا۔ دیکھ کر ماں اور بچے خائف ہو گئے۔ ماں ڈرپوک ذہنیت کی تھی۔ لیبس رات سے پہلے واپس نہیں آیا کرتا تھا۔ اس آدمی کو وہ مکان کے سامنے اس طرح بیٹھا دیکھ کر خوف سے کانپنے لگی۔

لیبس مارٹن کا دوسرا شوہر تھا۔ اس کا پہلا بیاہ ایک ہوشیار ملاح سے ہوا تھا جو سمندر کا دُور دراز سفر کیا کرتا تھا۔ وہ ہر سال گرمیوں میں ویل مچھلی کا شکار پکڑنے کے لئے نیو فاونڈ لینڈ جایا کرتا تھا۔ اُس کا نام تھا مارٹن اسی لئے اس کی زوجہ کو مسز مارٹن کہتے تھے۔ دو برس تک یہ جوڑا مزے سے رہا۔ اسی دوران میں دو لڑکیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن شادی کے تیسرے سال جب مارٹن ویل مچھلی کے شکار کے لئے نیو فاونڈ لینڈ گیا۔ تو واپس نہ آیا۔ اُس جہاز کی کوئی خبر نہ آئی۔ جُوں جُوں وقت گذرتا گیا۔ لوگ خیال کرنے لگے۔ کہ وہ جہاز ڈوب گیا ہے۔ اور اُس کے ملاحوں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔

مسز مارٹن دس سال تک اپنے خاوند کی منتظر رہی۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ہمراہ ساحل سمندر کے اُس چھوٹے سے مکان میں گذرا وقت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ابھی تک اُسے اُمید تھی۔ کہ اس کا شوہر واپس آجائیگا۔ دس برس تک فضول انتظار کے بعد آخر کار وہ کامل طور پر مایوس ہوگئی۔

بالآخر اُس نے دوسری شادی کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی تک وہ کافی خوبصورت اور سڈول عورت تھی۔ اُسی گاؤں کے لیبس نام کے مچھلی مار کے ساتھ تقرب ہوتا چلا گیا۔ لیبس رنڈوا تھا۔ پہلی عورت سے اُس کا ایک لڑکا تھا۔ لیبس اور مارٹن کی محبت زائیاں پُرجوش ہوتی گئیں۔ آخر کار وہ بیاہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اور وقت گذرنے پر ان دونوں کے تعلقات سے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔

مارٹن اور لیبس کی خانداری خُوب مزے سے چل رہی تھی۔ انہیں گذارہ کی دقت ضرور تھی۔ مگر اور کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ان دنوں کھانا کافی مہنگا تھا۔ گوشت کا تو اس گھر میں قطعی قحط تھا۔ کئی بار انہیں قرض لیکر پیٹ بھرنا پڑتا تھا۔ مگر ارد گرد کے رہنے والے

ان کی خانگی زندگی کو کامیاب خیال کرتے تھے۔ لوگ کہا کرتے تھے ۔۔۔۔۔۔۔ اس علاقہ میں لیبیں سے اچھا مچھلی مار کوئی نہیں ہے۔ اور مارتن اس قدر مضبوط ہے جس طرح فولادی میخ۔

دروازہ کے پاس بیٹھی ہوئی اس لڑکی نے پھر کہا ۔۔۔۔۔۔۔ وہ ہماری طرف اسطرح دیکھ رہا ہے جس طرح ہمیں پہلے ہی جانتا ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اسی علاقہ کا کوئی بھکاری ہے، مگر اُس کی ماں کو یقین تھا۔ کہ وہ ارد گرد کا رہنے والا نہیں ہے۔

وہ بوڑھا اُسی طرح لکڑی کی مانند بے حس و حرکت قدم جمائے بیٹھا تھا۔ اور اس مکان کی طرف غراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مسز مارتن یہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ ہمت کر کے اُس نے ایک کدال اُٹھایا۔ اور دروازہ کے پاس آکر زور سے چلا کر بولی ۔۔۔۔۔۔۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

"میں ہوا خوری کر رہا ہوں۔ کیا میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے؟

تم میرے مکان کے چاروں طرف کیا تلاش کر رہے ہو۔؟

میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ کیا میں سڑک کے قریب بھی نہیں بیٹھ سکتا؟

مسز مارتن کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی میں چلی گئی۔

آہستہ آہستہ وقت گذرتا گیا۔ دوپہر کے وقت وہ نا واقف آدمی وہاں سے پھر اوجھل ہو گیا۔ مگر شام کے پانچ بجے کے لگ بھگ وہ پھر وہاں آگیا۔ اس کے بعد وہ پھر چلا گیا۔ مگر پھر واپس نہیں لوٹا۔

رات ہوئی تو لیبس گھر آیا۔ اُسے یہ واقعہ سنایا گیا۔

مُسکرا کر کہنے لگا ——— کوئی بدمعاش آدمی اسطرف چلتا پھرتا آ گیا ہو گا؟

لیبس نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی وہ آرام سے سو گیا۔ مگر مسز مارٹن (اب بھی وہ اسی نام سے مشہور تھی) کو نیند نہ آئی۔ وہ رات بھر اُسی ناواقف بوڑھے کے خواب دیکھتی رہی۔

دوسرے دن نسیم سحری سرائے بھرتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ اس حالت میں سمندر پر مچھلی کے شکار کیلئے جانا ممکن نہیں تھا لیبس گھر ہی ٹھہر گیا۔ اور اپنی زوجہ کو جال کی مرمت میں مدد دینے لگا۔

نو بجے کے قریب سب سے بڑی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ اُس نے چلا کر کہا ——— ماں وہ پھر آگیا ہے؟

یہ سُن کر ماں بھی گھبرا گئی۔ اُس نے اپنے شوہر سے کہا ——— لیبس اُسے جا کر کہو کہ وہ ہمیں اسطرح عزا کرنہ دیکھے۔ میرے لئے زیادہ برداشت ممکن نہیں۔

لیبس کافی لحیم شحیم اور توانا تھا۔ داڑھی سُرخ۔ آنکھیں نیلگوں گردن موٹی تھی۔ اور چہرہ خشت پختہ کی مانند لال تھا۔ وہ خاموشی سے باہر گیا۔ اور اُس اجنبی کے پاس پہنچا۔ کچھ دیر تک وہ آپس میں بات چیت کرتے رہے۔

ماں اور بچے دُوری سے کھڑے ہو کر انہیں دیکھتے رہے اُن کے اعضا جوشِ غضب سے لرز رہے تھے۔

اچانک وہ اجنبی بوڑھا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور لیبس کے ہمراہ گھر کی طرف چلا آیا۔

مسز مارٹن خوف کے مارے پیچھے ہٹ گئی۔

اُس کے شوہر نے اُسے کہا ——— یہ پرسوں سے بھوکا ہے اسے روٹی اور شراب

ہکا پیالہ دیدو

وہ دونوں جھونپڑی میں داخل ہوئے ماں اور بچے پیچھے پیچھے آئے۔ وہ بوڑھا چپ چاپ مکان کے اندر جاکر بیٹھا اور روٹی کھانے لگا۔

ماں کھڑی ہو کر اُس ناواقف بوڑھے کیطرف غور سے دیکھنے لگی۔ مسز مارٹن کی پہلی شادی کی دو لڑکیاں دروازہ کے سہارے کھڑی اس عجیب شخصیت کا جائزہ لے رہی تھیں دونوں چھوٹے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ سب سے چھوٹا منا بھی رونا بند کر چکا تھا۔ لیبس بوڑھے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اور دریافت کرنے لگا۔

"اچھا تو تم بہت دُور سے آرہے ہو؟"

"ہاں! کیپٹ سے"

"پیدل ہی طرح؟"

"ہاں! جب پیسہ نہ ہو تو کیا کیا جائے۔"

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں یہیں آرہا تھا۔"

"تم اس علاقہ میں کسی کو جانتے ہو۔"

"شائد۔"

اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ روٹی کھاتا جا رہا تھا۔ روٹی کے ہر ایک نوالہ کے بعد وہ ایک ایک گھونٹ شراب نوش کرتا جاتا تھا۔ اس کا منہ مرجھایا ہوا تھا۔ پیشانی پہ جھریاں پڑ گئی تھیں۔ رخساروں میں گڑھے ہو گئے تھے۔ اُس کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس نے نہایت خوفناک مصائب کا سامنا کیا ہے۔

لیبس نے اُس سے پھر دریافت کیا ــــــ

تمہارا نام کیا ہے؟

اُس بوڑھے نے اسی طرح سر جھکائے ہوئے کہا ــــــ میرا نام مارٹن ہے۔

"مارٹن" کا نام سنتے ہی ماں کا سارا جسم فی الفور لرز اُٹھا۔ وہ اس اجنبی کو ذرا دھیان سے دیکھنے کیلئے ایک قدم اور آگے بڑھی۔ اُس کے بازو ڈھیلے تھے۔ مُنہ کھلا ہوا تھا۔

کچھ دیر تک سب لوگ خاموش رہے۔ اس کے بعد لیبس نے پوچھا۔

"کیا تم اس علاقہ کے رہنے والے ہو؟

"ہاں میں اسی علاقہ کا رہنے والا ہوں۔

انجام کار جب اُس نے اپنا سر بلند کیا تو مسز مارٹن اس کی طرف پوری توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔

اچانک مسز مارٹن نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا ــــــ "کیا تم ہو مالک!"

اس کی آواز مدھم اور لرزیدہ تھی۔

"ہاں میں ہی ہوں" ــــــ اُس نے آہستہ سے کہا۔

وہ حرکت، زن نہیں ہوا بالکل اسی طرح روٹی کے نوالے چباتا رہا۔

لیبس کو طیش نہیں آیا۔ اُس نے حیرت سے پوچھا ــــــ اچھا مارٹن تم ہو؟

ہاں میں ہی ہوں ــــــ اُس نے صرف یہی جواب دیا۔

تم اب کہاں سے آرہے ہو؟

مارٹن نے اپنی سرگذشت اس طرح بیان کرنی شروع کی۔

"میں اب افریقہ کے ساحل سے آرہا ہوں جہاز کی غرقابی سے ہم تین آدمی زیچ

رہے تھے۔ بگڈ، ورنیل اور میں۔ اس کے بعد ہمیں جنگلی لوگوں نے پکڑ لیا۔ اُن کے پاس ہم بارہ سال تک رہے۔ بگڈ اور ورنیل تو عالم فانی کو کوچ کر گئے۔ ایک میں ہی بچ گیا۔ ایک انگریز مسافر نے مجھے وحشیوں سے رہائی دلائی، اور واپس لے آیا۔ اب میں وہاں سے ہی آیا ہوں"۔

مسز مارٹن نے اپنا منہ آنچل میں چھپا لیا تھا۔ اور اُس نے رونا شروع کر دیا۔

لیبس نے پوچھا ——— اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

مارٹن نے پوچھا ——— کیا تم اب اس کے شوہر ہو؟

لیبس نے جوابدیا ——— ہاں میں ہی ہوں۔

وہ دونوں ایکدوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کسی کی زبان سے کوئی لفظ تک نہ نکلا۔ اس کے بعد مارٹن نے بچوں کیطرف دیکھا۔ اور ان دو بڑی لڑکیوں کیطرف اشارہ کر کے دریافت کیا ——— کیا وہ لڑکیاں میری ہیں؟

ہاں وہ تمہاری ہی ہیں۔

مارٹن بیٹھا رہا۔ اُٹھ کر اُن کا بوسہ بھی نہ لیا۔ صرف یہی کہا ——— خدا کی عنایت! یہ اس قدر بڑی ہو گئی ہیں؟

لیبس نے پھر پوچھا ——— اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

مارٹن کو کچھ نہ سوجھا۔ وہ پریشان تھا۔ آخر کار اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور کہا۔ جیسا تم کہو گے میں ویسا ہی کرونگا۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ لیکن جب اس مکان کا خیال کرتا ہوں۔ تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میرے دو بچے ہیں۔ اور تمہارے ہیں۔ ہم دونوں کے اپنے اپنے بچے ہیں۔ ان بچوں کی ماں تمہاری بھی ہے اور میری بھی۔

تم جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہے لیکن یہ مکان۔ یہ تو میرا ہے۔ میں اسی میں پیدا ہوا تھا۔ یہ مجھے اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ میرے وکیل کے پاس اس کے کاغذات بھی ہونگے۔

مسز مارٹن ابھی تک رو رہی تھی۔ اُس کے عنابی آنچل سے خاموش ہچکیوں کی آواز ابھی تک سُنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں لڑکیاں اور بھی قریب چلی گئی تھیں اور بے چینی سے اپنے باپ کی طرف متوجہ تھیں۔ اب وہ کھانا کھا چکا تھا۔ اس دفعہ اُس نے پُوچھا —— ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔

لیبس کو ایک بات سُوجھ گئی۔ اُس نے کہا —— چلو ہم پادری کے پاس چلیں وہ فیصلہ کر دیگا۔

مارٹن اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنی زوجہ کی طرف بڑھا ہی تھا۔ کہ وہ اُس کی چھاتی پر آگری وہ ابھی تک رو رہی تھی —— "مالک کیا تمہیں ہو؟ مارٹن میرے غریب مارٹن کیا سچ مچ تم آگئے ہو؟"

دونوں دیر تک باہم ملتے رہے۔ کتنی ہی دیرینہ یادداشتیں۔ کتنی ہی پُرانی باتیں ان کے دلوں میں ہچکولے لے رہی تھیں۔

اپنی ماں کو روتے دیکھ کر دونوں چھوٹے بچے بھی رونے لگ گئے۔ سب سے چھوٹا بچہ تو چیخ مار مار کر رونے لگا۔

لیبس خاموش کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کہا —— آؤ چلو اب ہمیں جلدی کرنی چاہیئے۔

مارٹن نے اپنی زوجہ سے اجازت لی۔ وہ بھی اپنی دونوں لڑکیوں کو دیکھ ہی

رہا تھا۔ کہ ماں نے کہا ــــــ اپنے ابا کا بوسہ تو لے لو۔

وہ دونوں آئیں۔ اُن کی آنکھیں خشک تھیں۔ وہ حیرت زدہ اور کچھ خائف تھیں۔ اُس نے ان دونوں کے اچھی طرح بوسے لئے۔ اس کے بعد وہ دونوں آدمی باہر چلے گئے۔

جب وہ راستہ سے ایک ہوٹل کے سامنے سے گزرے تو لیبس نے کہا ــــــ چلو کچھ کھا پی ہی لیں۔

مارٹن نے کہا ــــــ بہتر۔

وہ دونوں اندر جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل بالکل خالی تھا۔ لیبس نے آواز دی او لڑکے! بات سنو۔ دیکھو! سب سے عمدہ شراب لے آؤ۔ یہ مارٹن ہیں۔ یہ اب واپس آ گئے ہیں تم جانتے ہو کون مارٹن؟ میری زوجہ کا مالک۔ وہی مارٹن جو جہاز پر گیا تھا۔ اور گم ہو گیا تھا۔

بیرہ آیا۔ اُس کی توند گھڑے کی مانند تھی۔ اور آنکھیں سُرخ انگارہ۔ ایک ہاتھ میں بوتل کا برتن اور دوسرے میں گلاس لیکر وہ کمرے میں داخل ہوا۔

"اوہ! تم آ گئے مارٹن؟"

"ہاں میں آ گیا"

ــــــ

امین خاور خوشنویس لاہور ۱۹۴۳ء

(آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام شری پریم چند پرنٹر۔ پبلشر چھپا)